معارف

اکتوبر ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۶ | ماہ صفرالمظفر ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۲۰ء | عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

تاریخ اقوام کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو ہزار برس سے دیہاتوں کے سوا کوئی عام ملکی اور قومی اتحاد نہیں پیدا ہوا، اس لیے اس زمانہ سے آج تک غیر قوموں کی جولان گاہ بنا ہوا ہے، ہر قوم اس میں نہایت آسانی سے حکومت قائم کر لیتی ہے اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے نکل بھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ کئی غیر دانش مندانہ حکومتی فیصلوں کی وجہ سے ملک کے جمہوری اور سیکولر آئین نے عام ملکی اور قومی اتحاد کو زیادہ مستحکم نہیں کیا لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ ملک کے اتحاد کو بہر حال قائم رکھنے کی ایسی کوشش جاری رکھی جس سے کسی اور غلامی کا امکان ہی پیدا نہ ہو، بلکہ ایک خاص نظریہ قومیت کو جمہوری اخلاقیات اور سیکولر روایات نے کبھی پسند نہ کیا اور اس کی تنگ نظری اور اس سے زیادہ اس کی تنگ دلی سے بددلی کا مسلسل اظہار کیا اور جس کے عزائم اور مقاصد کی خطرناکی یا زہرناکی سے ایسے طبقہ نے برابر آگاہ کیا جو قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سے بخوبی واقف ہے، بدقسمتی سے اسی نظریہ کو کسی نہ کسی طرح ملک میں اقتدار کی مسند ملی اور نظریاتی غلبہ بھی حاصل ہوا، اس کے اسباب جو بھی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ محض عوام کی رائے کا مدوجزر نہیں، نہ شکست و فتح کی جمہوری روایتوں کا اثر ہی ہے، آئین کے نام پر آئین شکنی کا عمل کتنا نقصان دہ اور دوررس اثرات کا حامل ہوسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اب ملنا شروع ہو گیا ہے اور یہ خدشہ بالکل نامناسب نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عہد تقلیب ہے، جمہوریت کے فسطائیت یا آمریت یا عنان کی مطلقیت میں بدل جانے کا۔

ادھر چند برسوں میں ملک نے حکومتی، انتظامی اور احتسابی تمام اداروں کا جو طرز عمل دیکھا اور ان سب کی تہہ میں رواں ایک اجنبی سی لہر کا مشاہدہ کیا، اب وہ لہر ایک موج بے پروا کی شکل لے چکی ہے، جس کا پھیلاؤ صرف زراعت اور تجارت پر مبنی معیشت ہی تک نہیں عوامی بہبود کے بنیادی وسائل بھی ایسے طوفانوں کی زد میں ہیں جو ملکی اور قومی اتحاد کو اسی خطرہ سے دوچار کر سکتے ہیں جس کی پیش گوئی قدیم مورخین کی زبان سے صادر ہو چکی ہیں۔

دبی دبی زبان میں کھلی کھلی حقیقت کے اس اظہار کی ایک وجہ دہلی کی مرکزی حکومت کی جانب سے ایک قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل نو ہے، تعلیم کسی قوم کی قوت اور اس کی تہذیبی سطوت اور تمدنی شوکت کی خشت اول ہے، اسی لیے کوئی بھی حکومت اس شعبہ کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل رکھنا فرض عین سمجھتی ہے، انگریزوں کے عہد سے ملک کی آزادی تک اور آزادی کے بعد برسوں تک تعلیمی پالیسیوں اور درس و تدریس اور نصابوں کے داخل خارج اور زمینی تنوع کو مدنظر رکھ کر پورے ملک کو ایک قومی منصوبہ کی ڈور میں پرونے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ۲۰۱۹ء کی قومی تعلیمی پالیسی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا آغاز اس نیت اور غرض سے ہوتا ہے کہ یہ قومی پالیسی ایک ایسے ہندوستان مرکوز نظام تعلیم کا تصور رکھتی ہے جو سب کو اعلیٰ تعلیم فراہم کرے، اس سے ملک کی پائیداری کے ساتھ مساویانہ اور علم دوست معاشرہ کو ایک شکل دینے میں براہِ راست تعاون ملے گا، اس پالیسی کا مسودہ ہمارے سامنے ہے، کلیدی نکات دیکھنے کی بات ہو تو دور سے یہ خوبصورت الفاظ کا ایک شیش محل نظر آتا ہے لیکن قریب سے دیکھیے تو ہر شیشہ پس تیشہ ہے، مثلاً اعلیٰ تعلیم کے باب میں نظم و نسق کی ذیلی سرخی کے تحت کہا گیا کہ یہ نظم و نسق، تعلیمی، انتظامی اور مالی خود مختاری پر مبنی ہوگا، ضابطہ کاری ہلکی لیکن سخت ہوگی، خود مختار مجلسیں، مفادات کا تصادم ختم کرنے کے لیے ہوں گی، پھر بیچلر آف ایجوکیشن کا نیا کورس ہوگا، تربیت اساتذہ کے غیر معیاری اور غیر کارآمد ادارے بند کردیے جائیں گے، آگے کہا گیا کہ اس پالیسی کا مقصد تمام ہندوستانی زبانوں کے تحفظ، نشوونما اور فعالیت کو یقینی بنانا ہے اور نجی سرکاری اور سماجی معیار کی ضابطہ کاری یا رسمی منظوری کا نظام بھی قائم کرنا ہے، کم از کم درجہ پانچ تک تعلیم مقامی زبان یا مادری زبان میں ہوگی، ترجیحاً درجہ ہشتم تک بھی ہوسکتی ہے، سہ لسانی فارمولے کو پوری طرح نافذ کیا جائے گا، غرض اس قسم کی اکثر وہ باتیں ہیں جو اشتہاروں کی شکل میں عام طور سے کسی نئے اسکول یا کالج کے لیے ہینڈ بلوں میں لکھی جاتی ہیں، ان کی معقولیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے لیکن جب مشن نالندہ اور مشن تکسلا ذہن سے منصوبہ کی شق میں آجائے تو پھر کہنے والے کے طرز فکر و عمل پر نظر پڑ ہی جاتی ہے، ایک فاضل نے تو صاف لکھ دیا کہ ۱۹۶۸ء میں اندرا گاندھی اور ۱۹۸۶ء میں راجیو گاندھی کے دور کی تعلیمی پالیسیوں کے برخلاف اس جدید قومی منصوبہ میں بے شمار خامیاں ہیں، اسی لیے ملک کے منصف مزاجوں نے ان خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کو مخصوص طرز فکر کا ایک نیا آئین قرار دیا، زبانوں میں ہندی

اور سنسکرت کو مسلط کرنے کا اندیشہ بیچارے اردو والے کیا ظاہر کرتے لیکن ٹامل ناڈو کی تمام گروہ اور پارٹیاں اس منصوبہ کے پس پشت برہمنی تسلط سے بیزاری کرتے نظر آتے ہیں، پی چدمبرم کی یہ بات بھی اہم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے نقطہ نظر سے اسکولی تعلیم عوامی فلاح و بہبود کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسا شعبہ ہے جہاں خانگی منافع حاصل کیا جا سکتا ہے، یہ دراصل حصول تعلیم کو زیادہ مہنگا بناتا ہے، اب تک حکومت نے جتنے اہم اعلان کیے ہیں سب نہایت بلند و بانگ آہنگ کے ساتھ، لیکن ان کا نقصان ناممکن تلافی کی شکل ہی میں سامنے آیا، گو ایک طبقہ ہمارے ہاں خوگران حمد و ثنا کا ہے جو ہر بات میں سمعنا و اطعنا کی گردان میں خوف و خضوع سے لگ جاتا ہے، یہاں بھی اس نے سمجھا یا کہ اس منصوبہ سے سب سے زیادہ فائدہ اردو کو ہوگا، اوروں کی عیاری میں اپنوں کی سادگی کا تلازمہ خدا جانے کب ختم ہوگا اور پھر اس قوم سے کیا توقع کی جائے جس کے دعوت ناموں میں لکھ دیا جائے کہ فلاں فلاں مسلک والے شرکت کے لیے قطعی مدعو نہیں، ایک اخبار میں ایک بزرگ کی وفات کی تعزیت میں یہ جذبے فخریہ بیان کیے گئے، ایسے میں دینی و عربی مدارس کے ذمہ داروں سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ ایک مہلک ترین تعلیمی پالیسی کے سود و زیاں کے جائزے میں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

دینی و عربی مدارس میں طلبہ کو تقریر و تحریر کی مشق اور اس کی تربیت الحمدللہ آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں جاری و ساری ہے، اس میں ایک اضافہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ منتہی درجات کے طلبہ اپنے ذاتی خرچ سے ہر سال کتابیں بھی شائع کرتے ہیں، اس سلسلہ میں نمایاں نام جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا ہے جہاں آخری درجات کے طلبہ کی طرف سے کوئی وقیع کتاب شائع ہوتی ہے، اس سال انہوں نے ابوالمواہب عبدالوہاب بن احمد شعرانی کی ایک قابل قدر کتاب میزان الشریعۃ الکبریٰ بڑے اہتمام سے شائع کی، اس کے لیے طلبائے عزیز اور ان کے اساتذہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

محترم ناظم صاحب دارالمصنّفین اب بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے، دعاؤں کی درخواست ہے۔

مقالات

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ اور سیرتِ نبویؐ سے گہرا شغف

جناب ظفرالاسلام اصلاحی

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ (۲۸؍شعبان المکرم ۱۲۸۳ھ، ذی القعدہ ۱۳۷۰ھ۔ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء، ۱۱؍اگست ۱۹۵۰ء) ''حبیبِ شبلی'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ ''مکاتیبِ شبلی'' میں ان کے نام علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کے خطوط ان کے مابین گہرے تعلقات اور بے تکلفانہ مراسم کے شاہدِ عدل ہیں۔ مولانا شروانی کے خطوط ابھی زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں ورنہ اس باب میں مزید شواہد سامنے آجاتے۔ بہرحال ایک دفعہ اپنے ''حبیب'' کی جانب سے خیریت طلبی میں تاخیر ہونے پر علامہ نے ان کے نام خط میں یہ تحریر فرمایا تھا: ''آپ سے میرے تعلقات بالکل اخوتِ اصلی ہی کے ہیں''۔(۱) ان دونوں بے تکلف دوستوں کی علمی دلچسپیوں میں جو باتیں بطور قدرِ مشترک ملتی ہیں ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: کتابیں (بالخصوص نادر و قیمتی نسخے) جمع کرنے کا شوق، مطالعۂ کتب سے گہرا شغف، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ تعلق، تذکرہ و سوانح میں دلچسپی اور اسلامی و مشرقی علوم کی ترویج و شاعت کے لئے اپنی صلاحیتوں کا بخوبی استعمال۔ مزید یہ کہ گوناگوں مصروفیات کے باوجود بیش بہا علمی خدمات دونوں کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ مختلف النوع موضوعات پر متعدد کتابوں کے علاوہ سینکڑوں مقالات و مضامین ان کی علمی یادگاروں میں شامل ہیں۔ واقعہ یہ کہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی صاحب مرحوم بھلے ہی بھیکم پور ریاست کے وارث یا نواب رہے ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک علمی ریاست کے بھی بانی مبانی تھے اور انہوں نے بھیکم پور کی ریاست کو اس کا خادم بنا دیا

سابق استاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

جس کے فیض سے مختلف علوم وفنون کو فروغ نصیب ہوا اور مسلمانوں کے قدیم علمی وثقافتی ورثہ کے تحفظ کی راہیں ہموار ہوئیں۔

تصنیفی وتالیفی میدان میں مولانا شروانی کی مصروفیات مختلف الجہات رہی ہیں۔قرآن، حدیث، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، رجالِ حدیث، اسلامی تاریخ وثقافت، تعلیم وتربیت، علماء ومشائخ کے تذکرے، علمی وتحقیقی ادارے، فضلائے مدارس کی دینی وعلمی خدمات، عہدِ اسلامی کے ہندوستان کی تمدنی و ثقافتی جھلکیاں، فارسی و اردو شعر وادب میں کون سا میدان ہے جس میں انہوں نے اپنے علمی نقوش نہ چھوڑے ہوں، لیکن ان کے تقریریں اور مطبوعہ کتب اس کی شاہد ہیں کہ اسلامی علوم میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ یہ بھی حسنِ اتفاق، جیسا کہ بخوبی معروف ہے، ان کے صدیقِ حمیم کی علمی فتوحات میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عظمت ومقبولیت کے اعتبار سے سرِ فہرست ہے۔ مولانا شروانی کی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے گہری دلچسپی پر ان کے نام علامہ شبلی کے خطوط (بالخصوص ۱۹۱۲ء-۱۹۱۴ء کے درمیان تحریر کردہ) سے بھی شہادت ملتی ہے۔ اس عرصہ کے بیشتر خطوط میں کسی نہ کسی نسبت سے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں خاص طور سے یہ نکات قابلِ ذکر ہیں: کتاب کی تالیف کا پس منظر، اس کے مباحث کا خاکہ اور اس کی مجوزہ چار جلدوں کی اطلاع، اس کے لئے نام مجوزہ نام کے سلسلہ میں رائے طلبی، زیرِ مطالعہ مآخذ کی وضاحت، بعض انگریزی مآخذ سے کچھ منتخب صفحات کے انگریزی ترجمہ کی درخواست، کتب خانۂ حبیب گنج سے مطلوبہ کتب ارسال کرنے کی فرمائش، کتاب کی تالیف میں پیش رفت کی اطلاع، سیرت پر مستشرقین کی کتابوں کی فاش غلطیوں پر تبصرہ، کتاب کے مسودہ پر نظرِ ثانی کی خواہش کا اظہار، طباعت کے آغاز اور ادارہ الہلال سے نمونہ کے صفحات کی طباعت سے آگاہی۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ترتیب وتالیف اور طباعت سے متعلق یہ امور بلاشبہ مکتوب الیہ گرامی کی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خصوصی شغف اور اس پر گہری نظر کے غمّاز ہیں۔ ایک خط سے یہ دلچسپ اور اہم بات بھی سامنے آئی کہ مولفِ گرامی نے سب سے پہلے اس کا نام ''دائرۃ المعارف النبویہ'' تجویز کیا تھا اور اس سلسلہ میں مولانا شروانیؒ کی رائے جاننی چاہی تھی۔(۲)

یہ بخوبی معروف ہے کہ مولانا شروانی کی علمی خدمات کا ایک نہایت قابلِ قدر پہلو کتب خانہ حبیب گنج کا قیام وانصرام تھا۔ اس کی توسیع وترقی میں انہوں نے غیر معمولی دلچسپی اور لگن کا مظاہرہ کیا،

بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا، جیسا کہ اس سے متعلق خود صاحبِ کتب خانہ کے مضامین (مثلاً: حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا، کتب خانہ حبیب گنج کی فہرستِ کتب کا گوشوارہ) سے ثابت ہوتا ہے۔(۳) اسی دلچسپی کا ثمرہ تھا کہ یہ کتب خانہ عربی، فارسی، اردو و انگریزی مطبوعات و مخطوطات کا ایک بیش بہا ذخیرہ بن گیا اور یہ بعد میں مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا حصہ بن گیا جس سے آج بھی طلبہ، اساتذہ و محققین فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کتب خانہ دیگر موضوعات کے مثل کتبِ سیرت کا بھی بہترین مخزن ہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مولانا شروانی کے لٹریری اسسٹنٹ اور کتب خانہ حبیب گنج کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے والے مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندوی کے بیان کے مطابق ''سیرت کی شاید ہی کوئی معتبر کتاب ایسی ہو جو آپ (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم) کے کتب خانہ میں موجود نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات معلوم کرنے کا اصلی ذریعہ یا سرچشمہ صحیح احادیث ہیں۔ حدیث کی تمام معتبر و مستند کتابیں، جو علما محدثین کے حلقے میں قابلِ اعتماد مانی گئی ہیں، نواب صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھیں''۔(۴) یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ کتابیں جمع کرنے کے شوق کے ساتھ مطالعۂ کتب ان کا دلچسپ و محبوب مشغلہ رہا ہے اور اس دلچسپی کا میدان بھی کافی وسیع تھا۔ بقول مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندوی ''نواب صاحب صرف کتابیں نہیں جمع کرتے تھے، ان سے استفادہ بھی کرتے تھے''۔(۵) مطالعۂ کتب میں ان کے انہماک کا ایک واضح ثبوت کتب خانہ حبیب گنج کی کتابوں پر جا بجا ان کے تاثرات، تبصرے اور تصحیحات سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں سید معین الدین شاہجہاں پوری (ریاست حیدر آباد میں دفتر صدر الصدور کے منتظم اور تقریباً ۶ برس تک مولانا شروانی کی زندگی کے بہت قریبی مشاہد) کا یہ بیان کافی ہے: ''مطالعہ کا انداز کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتب خانہ سے میں نے بہت دفعہ کتابیں لیں، کھولیں اور پڑھیں بھی، لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس میں پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ، صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہوں''۔(۶) اس بیان کی مزید تصدیق بعض اہل قلم کے مضمون سے ہوتی ہے جس میں انہوں نے زیرِ مطالعہ کتب پر محترم شروانی صاحب کے تاثرات و تبصرات بڑے سلیقہ سے جمع کر دیے ہیں۔(۷) واقعہ یہ کہ اس عاشقِ رسول نے نہ صرف یہ کہ اپنے کتب خانہ کو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہترین ذخیرہ سے مالا مال کیا تھا، بلکہ وہ انہیں نہایت شوق سے

پڑھتے بھی تھے۔ یہاں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ محترم شروانی صاحب نے اپنے مضمون ''میری محسن کتابیں'' میں سب سے پہلے قرآن کریم کے تذکرہ کے بعد متعدد حدیث ورجالِ حدیث کی کتابوں کو ذکر کیا ہے،(۸) مزید براں سیرتِ نبویؐ پر محترم شروانی صاحب مرحوم کی تقاریر، مولفہ کتب ورسائل اور مضامین میں محولہ مآخذ اس موضوع پر ان کے وسعتِ مطالعہ کی کھلی شہادت پیش کررہے ہیں۔

واقعہ یہ کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مولانا شروانی کے گہرے شغف کے اصل مظاہر سیرت کے جلسوں میں ان کی تقریروں میں ملتے ہیں۔ان میں بیشتر کا تعلق حیدرآباد اور حبیب گنج میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسوں سے ہے۔سیرتِ پاک سے نواب صاحب کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ حیدرآباد میں وہ خود محافلِ سیرت کا نظم فرماتے تھے۔ بعض اکابر کی تحریروں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ ''حیدرآباد کی میلاد کی مجلسوں کے بانی تھے''۔(۹) اس ضمن میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس شہر میں محافل میلاد پہلے سے جاری تھیں، لیکن ان میں زیادہ تر پیشہ وران میلاد خواں سرگرم رہتے تھے۔ان کی باقاعدہ مختلف پارٹیاں یا ٹولیاں تھیں جنھیں لوگ اپنے گھروں پر بلاتے تھے، یہ میلاد پڑھنے والے رات بھر جاگ کر جو کچھ ہوتا بیان کرتے اور اردو، فارسی وعربی کے اشعار خوب جھوم جھوم کر پڑھ کر رات بھر محفل کو گرم رکھتے اور صبح کو اپنی فیس لے کر واپس چلے جاتے۔حیدرآباد میں سیرت کی قدیم مجالس کی روداد پیش کرنے کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس ضمن میں مولانا شروانی کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسوں کا ایک نیا نظام قائم کیا، اندرونی طور پر دلوں میں تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات میں عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصبِ جلیل کا کیا اقتضا ہے، ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو۔سیرت سے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق تھا۔ بیان و خطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات ان کے نکھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے۔جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے اور گھنٹہ دو گھنٹہ سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مسلسل پُر مغز، موثر تقریر فرماتے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا مذاق

بدلنے لگا اور بجائے انفرادی مجلسوں کے اجتماعی مجلسوں کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے، واقعہ یہ ہے کہ بھلانے سے نہیں جاسکتے‘‘۔(۱۰)

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا شروانی حیدرآباد میں باوقار، معیاری اجتماعی مجالسِ سیرت کے بانی تھے۔ان کے قریبی رفیق اور حیدرآباد کے واقعات کے بنفس نفیس مشاہد کے مذکورہ بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ذاتی دلچسپی اور مسلسل جدوجہد سے سیرت کی پیشہ ورانہ غیر معیاری انفرادی مجلسوں کو ایک سنجیدہ و باوقار اجتماعی مجلس بنادیا جس میں خود مولانا گیلانی کے بیان کے مطابق حیدرآباد کے جلسۂ سیرت میں شریک ہونے والوں کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہنچ جاتی تھی اور ان کی تقریر کو (جو زیادہ تر قرآن وحدیث کی باتوں پر مبنی ہوتی تھی) نہایت شوق سے سماعت کرتے تھے۔ ان کی تقریروں میں دلچسپی اور ان کی تاثیر کے بارے میں مولانا گیلانی کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

’’اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی تقریروں کو سننے والوں میں مجھے اکتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کہتے جاتے اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالاں کہ ان کی تقریریں جعلی حدیثوں، جھوٹے تراشیدہ افسانوں، بلکہ شعر ونغمہ کی دلچسپیوں سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھیں، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتوں سے نکالے ہوئے صحیح نتائج، معتبر حدیثوں اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی میں اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہوجاتی تھی کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسروں کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی‘‘۔(۱۱)

سیرتِ نبوی ﷺ پر مولانا شروانی کی تقریریں پہلے اخبارات و رسائل (بالخصوص اخبار صحیفہ، حیدرآباد اور کانفرنس گزٹ، علی گڑھ) میں شائع ہوتی تھیں، بعد میں ان تقریروں کے متعدد مجموعے رسائل کی صورت میں شایع ہوئے۔ ان میں کچھ معروف یہ ہیں: ذکرِ جمیل (شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء)، ذکر الحبیب (مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۲۷ء)، ذکرِ شریف (شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء)، پیغامِ رحمت (شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۷ء)۔ ان رسائل کے علاوہ مولانا شمس تبریز خاں کی کتاب میں کچھ اور رسائل سیرت (شمعِ ہدایت، آفتابِ رسالت، شانِ رسالت، اسوۂ حسنہ، شمائل مبارک) کا ذکر ملتا ہے،(۱۲) لیکن علی گڑھ

میں ان تک رسائی نہ ہوسکی۔ان رسائل سیرتِ نبوی ﷺ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے۔مثلاً ذکرِ جمیل،جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا، وقفے وقفے سے اس کے سات ایڈیشن اشاعت پذیر ہوئے۔ان کے نبیرۂ محترم پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے اس بیان سے ان رسائل کی مقبولیت کی مزید تصدیق ہوتی ہے:"سیرتِ پاکؐ پر ان کے کئی رسالے جو دراصل حیدرآباد اور حبیب گنج میں ان کی محفلِ میلاد میں تقاریر پر مشتمل ہیں، بہت مقبول ہوئے ہیں۔ان تمام تقاریر یا رسائل کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں قرآن مجید کی کسی آیت کی تشریح کی گئی ہے جس میں نبی کریمؐ کا کوئی وصف بیان ہوا ہے۔مجھے یاد ہے کہ اپنی حبیب گنج کی ایک ایسی ہی تقریر میں انہوں نے "رفعنا لكَ ذكركَ" کی تشریح فرمائی تھی"۔(۱۳) مولانا شروانی مرحوم کے رسائل کے پایۂ استناد سے متعلق مولانا محمد اکرام اللہ ندوی کا یہ تبصرہ قابلِ ذکر ہے:"سیرت پر آپ نے متعدد رسائل تالیف کئے ہیں جو سب کے سب معتبر و صحیح احادیث و روایات پر مبنی ہیں،اس قدر معتبر کہ ایک مورخ یا مصنف اپنی کسی تصنیف میں بے تامل ان کا حوالہ دے سکتا ہے"۔(۱۴) مزید براں ان رسائل سیرت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے ان کے ٹائٹل کور کے سرنامہ پر کوئی نہ کوئی برمحل آیت کریمہ مندرج ہے۔رسول اکرم ﷺ سے محبت و گہری عقیدت اور آپؐ کی سیرتِ مبارکہ سے مولانا شروانی کی گہری دلچسپی پر یہ امر بھی دال ہے کہ سیرت نبوی ﷺ پر بیگم بھوپال نواب میمونہ سلطان شاہ بانو کا مرتبہ رسالہ "ذکرِ مبارک" میلاد کی مجالس میں کافی مقبول تھا۔بیگم صاحبہ نے اس کے تیسرے ایڈیشن کی ایک ہزار کاپیاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مفت تقسیم کرنے کے لئے عنایت فرمائی تھیں۔اخبارات میں اس کے اعلان کے بعد اس کی کاپیاں بہت جلد ختم ہوگئیں اور لوگوں میں اس کی کافی طلب تھی،تو مولانا شروانی مرحوم نے اپنے مصارف سے اس کی دو ہزار کاپیاں طبع کرا کے کانفرنس کے بک ڈپو کو بھجوا دیں۔اس کی معمولی سی قیمت مقرر کی گئی،تاکہ پڑھنے میں دلچسپی رکھنے والے ہی اسے منگوا سکیں،اس لئے کہ طلب کرنے والوں کی درخواستوں سے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ مفت تقسیم کے لئے دس ہزار کاپیاں بھی ناکافی ہوں گی۔(۱۵) یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ وہی محترمہ میمونہ سلطان صاحبہ ہیں جنھوں نے نواب سلطان جہاں بیگم کی ایما پر ایم۔اے۔او کالج میں دینیات کی درسیات کے لئے علامہ شبلی کے مولفہ رسالہ "تاریخ بدء الاسلام" کے فارسی ترجمہ (از: مولانا حمید الدین فراہیؒ) کا اردو ترجمہ

''آغازِ اسلام'' کے نام سے کیا تھا جو پہلی بار ۱۹۱۵ء میں مطبع ظلّ السلطان، بھوپال سے اشاعت پذیر ہوا۔(۱۶)

اسی ضمن میں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا شروانی مرحوم کا سفرنامۂ حج (الفوز العظیم) بھی رسولِ اکرمؐ سے ان کے والہانہ تعلق اور حرمینِ شریفین کے تئیں ان کے عقیدت مندانہ جذبات سے معمور ہے۔ وہ اہل خانہ کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں مبارک سفر سے مشرف ہوئے تھے۔ حسنِ اتفاق کہ ارضِ پاک میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کو ان کی رفاقت نصیب ہوئی تھی۔ یہ سفرنامہ پہلے معارف کے شماروں (فروری، مارچ، اپریل ۱۹۶۷ء) میں بالاقساط شائع ہوا تھا جسے کافی پسند کیا گیا۔ پھر یہ کتابی صورت میں معارف پریس، اعظم گڑھ سے ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں ناظمِ دار المصنّفین شاہ معین الدین ندویؒ کے دیباچہ کے ساتھ طبع ہوا۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی صاحب نے اسے ''نواب صاحب کی ذاتی قلبی واردات کا آئینہ'' قرار دیا ہے۔(۱۷) حج کے سفرنامہ کی حیثیت سے ''الفوز العظیم'' کی خصوصیات واضح کرتے ہوئے کتاب کے فاضل دیباچہ نگار رقم طراز ہیں:

> ''حج کے سفرناموں کا موضوع اور اس کے مباحث اگرچہ متعین ہیں، ان میں کم وبیش ایک ہی قسم کے معلومات وجذبات ہوتے ہیں، لیکن لکھنے والے کی شخصیت اور ذوق کی بنا پر ان میں بڑا فرق ہوجاتا ہے، یہی فرق اس سفرنامے اور دوسرے سفرناموں میں ہے۔ یہ سفرنامہ مصنف کی طرح لطافت و پاکیزگی کا مرقع ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت قلم کی ادب شناسی اور تحریر کی حلاوت وتاثیر ہے۔ پورا سفرنامہ اخلاص وعقیدت کے جذبات، قلبی تاثرات اور باطنی کوائف میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کی ہر ہر سطر سے حسنِ عقیدت اور حسنِ ادب کا آبِ زلال ٹپکتا ہے''۔(۱۸)

بلاشبہ اس سفرنامہ کے مشتملات مذکورہ بالا دونوں حضرات گرامی کے تاثرات کے آئینہ دار ہیں، اس کی سطر سطر ارض مقدس میں حاضری پر مصنف محترم کے اظہار عاجزی وتذلل وبندگی کی کیفیت، اللہ رب العزت کی حمد وثنا اور تشکر کے کلمات، مقاماتِ متبرکہ کے تئیں انتہائی ادب واحترام کے جذبات اور ان کی زیارت پر قلب کو نصیب ہونے والی سرور وسکون کی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب ارکانِ حج میں سے کسی رکن کی ادائیگی سے مشرف ہوجاتے، یا اس دوران انہیں اللہ کا کوئی خاص فضل وکرم نصیب ہوتا اور قلب کو سکون واطمینان میسر آتا تو شکر الٰہی کے جذبے سے لبریز ہوجاتے، بلکہ سراپا شکر وسپاس

بن جاتے اور زبان پر یہ کلماتِ تشکر جاری ہوجاتے: فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیّباً مبارکاً فیہ، یہ الفاظ مبارکہ اس سفرنامہ میں جا بجا ملتے ہیں۔ اسی طرح کسی متبرک مقام پر پہنچ کر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی یا کسی مقام پر اللہ سے محبت و قربت اور رسولؐ سے عقیدت کے جذبات سرشار ہوجاتے تو اس کی مناسبت سے سفرنامہ میں آیتِ کریمہ بھی نقل کی ہے۔ مکۃ المکرمہ میں شرفِ دخول کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی تحریر کرتے ہیں:

"دعاؤں کے وِرد کے ساتھ عصر کے وقت لاریاں مکہ مکرّمہ پہنچیں اور ایک عمر کی تمنا بلکہ حاصلِ زندگی تمنا فضلِ ربانی سے برآئی، زیارتِ بیت اللہ المکرم و حاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیّباً مبارکاً فیہ"۔(۱۹)

جبلِ رحمت پر حاضری سے مشرف ہونے کے بعد جس کیفیت سے وہ سرشار ہوئے اسے بھی ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"اس کے بعد جبلِ رحمت کی حاضری سے مشرف ہوا، میرے ہم نام مولوی (حبیب الرحمٰن لدھیانوی) ساتھ لے گئے۔ مقام ناقۂ نبوی قصوا نامی کے قریب حاضر ہوکر دعا شروع کی، ہاتھ اٹھنے کے بعد دعاء کے الفاظ زبان پر آئے تھے کہ قلب میں ایک جوشِ خضوع پیدا ہوا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ تَرٰٓی اَعۡیُنَہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ (المائدۃ: ۸۳)، بدن جھک گیا، معاصی کی یاد اور ندامت دل جسم کو گھلائے دیتی تھی، گھلاوٹ آنسو بن کر آنکھوں سے رواں تھے، اسی عالم میں دیر تک استغفار و دعا کا سلسلہ جاری رہا، الحمد للہ خضوع و خشوع کا وہ عالم طاری ہوا جو مدۃ العمر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آنسوؤں سے نہ صرف چہرہ اور داڑھی تر ہوئی بلکہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں بھی تر ہوگئیں، قال اللہ تعالیٰ: تَرٰٓی اَعۡیُنَہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ، یہ بیّن دلیل جوشِ رحمت کی تھی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیّباً مبارکاً فیہ۔ ختمِ دعا کے بعد قلب نے راحت سکون محسوس کی جو یہ نعمت تعالیٰ دلیلِ قبول دعا ہوگی"۔(۲۰)

حقیقت یہ کہ مبارک سفر کے دوران مختلف متبرک تاریخی مقامات کی زیارت کرتے ہوئے

مولانا شروانی مرحوم پر جو رقت طاری ہوئی یا اپنی عاجزی و درماندگی اور اللہ رب العزت کی عظمت و بزرگی اور اس کے رسولؐ سے محبت و عقیدت اور آپؐ کے اصحابِ کرامؓ و بنات طیّبات و ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہنّ سے تعلق خاطر کے جو نقوش دل و دماغ میں ثبت ہوئے تھے، ایک دو یا چند برس نہیں، بلکہ مدتوں ان کی تازگی سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کیفیت میں شریک کرتے رہے۔ اس کا ایک واضح ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، اس کے کئی برس بعد "سیرتِ عائشہؓ" کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی خبر پر سید صاحب کے نام مکتوب میں اظہارِ مسرت کرتے ہوئے حج کے دوران مزارِ ام المومنین پر حاضری کے وقت کا پورا منظر ان کے سامنے آ گیا اور اس بارے میں انہوں نے جو کچھ اپنے سفرنامہ میں رقم فرمایا تھا اسے اپنے مخطوطہ سے نقل کر کے بھیج دیا۔ متعلقہ اقتباس نقل کرنے سے قبل وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکرر طبع پر اظہار مسرت کر چکا ہوں، دل میں آیا کہ سفر حجاز میں حاضری جنۃ البقیع کے موقع پر حضرت صدیقہؓ کے مزار پُرانوار پر جو کیف میں نے محسوس کیا تھا وہ اپنے سفرنامے کے لکھے نسخے سے نقل کر کے آپ کو بھیجوں۔ و ھو ھٰذا:

> اس کے بعد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا، حاضر ہونے کے بعد امومیت کی نسبت اس قوت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی، جوش میں امّی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا اور روح محوِ ذوق تھی، بے شائبۂ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدتِ دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعۃً پالیا ہے اور جوشِ محبت و احساسِ شفقت سے بے تاب ہو کر امی امی پکار رہا ہے، الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں، غرض ایک عالم تھا جو اسی آستانۂ مرحمت کاشانہ کے ساتھ مخصوص تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا عنّی"۔(۲۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک سے والہانہ لگاؤ ہوا اور آپؐ کے مولد شریف، مسکن مبارک اور آخری آرام گاہ کی ارض مقدس (حرمین شریفین) سے تعلق نہ ہو، یہ سوچا نہیں جا سکتا۔ سفرنامۂ حج کے

ورق ورق پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہیں ہی، حرمین شریفین کی سالانہ خدمت (ترسیل رقم ہدیہ) سے اس کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ یہ قیمتی اطلاع (حبیبِ شبلی پر معارف کے خاص نمبر میں شائع شدہ) مولانا سید سلیمان ندویؒ کے معلوماتی اور وقیع مقالہ سے ملی جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں: ''حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے (سید صاحب کے آخری بار حج سے مشرف ہونے کا سن: ۱۹۴۹ء) میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا اور نہ میں نے یاد دلایا''، (۲۲) بعض خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ''خدمت شریفہ'' ایک دو برس نہیں، برسہا برس جاری رہی، ۲۴/اکتوبر ۱۹۲۲ء کو صاحب زادہ (حاجی عبیدالرحمٰن خاں شروانیؒ) کو تحریر فرمایا تھا: ''مدینہ طیبہ کی رقم اس مرتبہ ضرور بھیجی جائے، اس شعبۂ مبارکہ میں اب تک سخت انتشار اور معیشت کی تنگی ہے۔ یہاں تحریک کی جاتی ہے کہ سرکار عالی معقول رقم سے چند سال تک امداد کرے'' (۲۳) اس خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کی کی خدمت خود انجام دینے کے ساتھ ساتھ مولانا شروانی اپنے حلقۂ اثر میں اصحابِ وسائل واہلِ خیر حضرات میں اس کی تحریک بھی پیدا کرتے تھے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ مولانا شروانی کی یہ تحریک بارآور ثابت ہوئی جیسا کہ ندوۃ العلما کے ۲۲ ویں سالانہ جلسے کے چوتھے اجلاس میں منظور کی گئی ایک تجویز سے واضح ہوتا ہے۔ یہ اجلاس مولانا شروانی کے زیرِ صدارت ۲۷/نومبر ۱۹۲۷ء منعقد ہوا تھا اور یہ تجویز خود انہی نے پیش کی تھی۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''اعلیٰ حضرت حضور نظام خلّد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے مسجد نبویؐ مدینہ منورہ کی مرمت اور دیگر ضروریات کے لئے جو گراں قدر عطیہ نو لاکھ منظور فرمایا ہے اس کے لئے اجلاس ندوۃ العلما دلی تشکر کا اظہار اعلیٰ حضرت کی خدمت میں کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کو زمانۂ دراز تک اللہ تعالیٰ جاہ وجلال زندہ وسلامت رکھے اور اس اعلیٰ دینی خدمت کو قبول فرمائے''۔ (۲۵)

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مولانا شروانی کی گہری دلچسپی اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اپنے حلقۂ احباب ورفقاء میں اس موضوع پر یا اس کے کسی پہلو پر کسی کتاب کی تالیف/اشاعت کی خبر سنتے تو صاحبِ کتاب کو مبارک باد دیتے، دستیاب ہونے پر پڑھتے اور اس پر اپنے تاثرات بھی ظاہر کرتے

اور بعض اوقات سیرتِ نبویؐ پر پسندیدہ کتاب کی سینکڑوں کاپیاں خرید کرانہیں بطور ہدیہ تقسیم کرتے۔ ان کے نام ان کے حبیب خاص علامہ شبلی کے خطوط (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تالیف میں ان کی گہری دلچسپی اور مختلف نوعیت کے تعاون کی غمازی کررہے ہیں، مولف گرامی کے نام مولانا شروانی کے خطوط تک رسائی ہوجائے تو اس باب میں یقینی طور پر شواہد اور واضح ہوجائیں گے۔ بہرحال سیرت کی باقی جلدوں کی تکمیل پر علامہ شبلی کے تلمیذِ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام خط میں مولانا شروانی کا یہ مختصر تبصرہ بھی بہت کچھ کہہ رہا ہے: ''سیرۃ کی تاریخ کی تکمیل ایک تاریخی کارنامہ ہے''۔ (۲۵) اسی ضمن میں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور و مقبول کتاب ''رحمت عالم'' کو پڑھ کرانہوں نے یہ تاثر ظاہر کیا تھا: ''یہ اچھا کام ہوا، اس کو پڑھ کر آنکھیں پُرآب ہوئیں''، سید صاحب نے مولانا شروانیؒ کے ان تاثراتی کلمات کو معارف کے ''شذرات'' میں نقل کیا تھا۔ (۲۶) ''رحمت عالم'' کی مزید کاپیاں موصول ہونے پر اسے پڑھنے کے بعد ان پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس کی عکاسی کرتے ہوئے سو کاپیوں کی طلب پیش کی۔ خود ان کے الفاظ میں: ''ماہِ مبارک (رمضان) کی مزید برکت کا سامان ''رحمت عالمؐ'' کے چار نسخے اور سامی نامہ پہنچا...... آج صبح کھول کر پڑھی، ۷۵ صفحے پڑھ کر ہاتھ سے رکھی، آنکھیں پُرنم ہیں، دل پُرکیف، بارک اللہ۔ چار نسخوں کی قیمت بواپسی حاضر کی جاتی ہے، تقسیم نسخوں کی حسب منشائے سامی ہوگی۔ یہ آپ کی فرمائش پوری ہوئی، شوق کی فرمائش یہ ہے کہ سو نسخے فی نسخہ پانچ روپیہ کے حساب سے خریدوں''۔ خط میں آگے کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ سو نسخوں میں سے پچاس دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ میں تقسیم کے لئے تھے اور باقی دوسروں کے لئے۔ (۲۷) ''رحمت عالم'' کی نسبت سے محترم شروانی صاحب کی اس پیشکش یا طلب کو سید صاحب نے بڑے دل نشین انداز میں معارف کے شذرات میں ذکر فرمایا تھا۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہو:

> ''بہت سے اہلِ خیر حضرات نے اس (رحمتِ عالم) کے کئی کئی نسخے خرید کر عام لوگوں میں تقسیم کئے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک مخدوم نے جن کا ہاتھ ہر نیکی کی طرف سب سے پہلے بڑھتا ہے اور جو اس طرزِ تعبیر کے نکرہ ہونے کے باوجود اہل نظر کی نگاہوں میں معرفہ ہیں یہ قدر فرمائی کہ سو (۱۰۰) نسخے ایک ایک نسخہ

پانچ پانچ روپئے کو خرید کر مفت تقسیم فرمایا ہے۔ امید کہ دوسرے اہل خیر اسی قدردانی اور فیاضی کا ثبوت دیں گے''۔(۲۸)

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور احادیثِ شریفہ سے مولانا شروانی کے گہرے شغف پر یہ امر بھی دال ہے کہ سیرتِ پاک پر کتب و مضامین کے علاوہ عام دینی موضوعات پر تقریر و تحریر میں بھی قرآن، حدیث، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیرِ صحابہ سے بکثرت استشہاد کرتے تھے۔ اہم بات یہ کہ اپنی تقریروں و تحریروں میں احادیث، نبی کریمؐ کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کے واقعات نقل کرنے کے علاوہ مخاطب (خواہ سامعین ہوں یا قارئین) کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سبق حاصل کرنے اور روزمرہ زندگی میں ان پر عمل کی تاکید بھی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کے شعبۂ دینیات میں مولانا شروانیؒ نے ۱۹۰۲ء میں ''اسلامی اخلاق'' پر لکچر سیریز کے تحت کئی لکچر دئے تھے (جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوئے تھے)، ان کے مطالعہ سے مذکورہ باتیں اچھی طرح واضح ہوجاتی ہیں۔(۲۹) ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ بست ودوم۲۲ کے دوران اجلاس سوم (منعقدہ ۲۶ رفروری ۱۹۲۷ء) کے موقع پر خاص طور سے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے انہیں جو نصیحتیں کی تھیں ان میں ایک قیمتی نصیحت یہ بھی تھی:

''اے عزیز طالب علمو! چوتھی نصیحت یہ ہے کہ اتباعِ سنت اپنا شعار بناؤ۔ ظاہری شکل بھی موافقِ شریعت بناؤ، لیکن فضیلت علمی کو کپڑوں اور داڑھیوں تک محدود نہ سمجھو، بلکہ حقیقی علم کی شان یہ ہے کہ تمھارے ہر فعل سے علم کی خوشبو اور روشنی جلوہ گر ہو۔ میں دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو کامیاب کرے''۔(۳۰)

مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو بہت اہم ولائقِ اتباع ہے کہ وہ نہ صرف مطالعہ یا تصنیف و تالیف یا تقریر کی حد تک سیرتِ نبویؐ سے گہرا شغف رکھتے تھے، بلکہ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی اس کا بہت گہرا اثر جذب کرلیا تھا۔ ان کی روزمرہ زندگی کے بعض قریبی مشاہدین کا یہ تاثر بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے کتبِ سیرت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ یونہی (یعنی محض برائے مطالعہ) نہیں کیا تھا بلکہ ان کا گہرا رنگ ان پر چڑھ گیا تھا۔(۳۱) مولانا مرحوم کی زندگی پر قرآن وسنت کے گہرے اثرات کی تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن ان کے اخلاق و کردار یا اوصافِ محمودہ کے بارے میں جو کچھ بیانات کتب و مضامین میں ملتے ہیں یا اس ضمن میں اس ناچیز نے جو کچھ

ان کے نبیرۂ محترم پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی مرحوم کی زبانی ذاتی طور پر سنا تھا ان سے ان کی شخصیت اور صفاتِ حمیدہ کے یہ پہلو نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں: پرہیزگاری، نماز با جماعت کی پابندی (اور سفر میں اس پابندی کی برقراری کے لئے عام طور پر دو لوگوں کی رفاقت کا اہتمام) کردار کی بلندی، حسنِ اخلاق کا مظاہرہ، دیانت داری، غیبت سے نفرت، تواضع وانکسار اور نام ونمود سے دوری، نرم مزاجی، اعلیٰ ظرفی، علم نوازی، اہلِ علم کی قدردانی، مسارعت الی الخیرات کی روش، فقرا و مساکین کی خبر گیری و فراخ دلانہ اعانت، دینی اداروں اور ان کے متعلقین سے تعاون میں اظہارِ مسرت، دینی غیرت اور اسلامی شعار و اقدار سے عدمِ سمجھوتہ، فرائض منصبی کی بخوبی انجام دہی، ذاتی مفاد کے لئے عہدہ و منصب کے استعمال سے احتراز، خلقِ خدا سے محبت و ہمدردی، علماء و مشائخ سے تعلق خاطر اور دینی علوم کی خدمت کا جذبہ، یہ اوصافِ عالیہ خود اس امر کی وضاحت پیش کر رہے ہیں کہ ان کی روزمرہ زندگی پر قرآن وسنت کی تعلیمات کا کتنا اثر تھا۔

دوسرے یہ کہ مولانا شروانی مرحوم کے معاصرین یا ان سے براہ راست تعلقات و معاملات رکھنے والے حضرات (بالخصوص مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سید ابوالحسن ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندویؒ، سید معین الدین شاہجہاں پوریؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، جناب مالک رام) نے اپنے مضامین میں ان کے اخلاق و کردار اور معاملات کے بارے میں جو مشاہدات و تاثرات ظاہر کئے ہیں وہ لائقِ مطالعہ ہیں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی ایک اہم اخلاقی خصوصیت یہ بیان کی: ''ان کی مجلس میں کبھی کسی کی برائی یا غیبت نہیں ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اوڑا دیتے''۔(۳۲) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا یہ جامع تاثر بہت قیمتی ہے: ''غیرت اور حرارتِ ایمانی کے کہنا چاہئے کہ (وہ) پتلے ہی تھے''۔(۳۳) یہاں ان مشاہدات و تاثرات کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے، البتہ ان کے معروف سوانح نگار مولانا شمس تبریز خاں (جنھوں نے اپنی کتاب میں مذکورہ بالا بعض حضرات کے تاثرات درج کئے ہیں) کا ایک بیان نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے اوصاف کا خاص جوہر (نیکیوں کا منبع تقویٰ) سامنے آتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

''تقویٰ انسانی فطرت کی ایک ایسی نیکی ہے جس کے بعد انسان صرف نیکیاں

ہی کرتا ہے اور برائی اس کی طبیعت سے نکل جاتی ہے۔انسانیت کی اسی ارتقائی منزل کو قرآن نے نفس مطمئنّہ سے یاد کیا ہے۔مولانا مرحوم کو شروع سے تقویٰ کا بڑا اہتمام تھا اور اخیر دم تک تقویٰ اور صلاح کی شان ان میں اس طرح جلوہ گر رہی کہ اسے ان کی امتیازی صفت کہا جا سکتا ہے۔معاشرت و معیشت، تحریر و تقریر، زندگی کی ہر راہ میں تقویٰ ان کا رہنما تھا اور اس نے زندگی کی آلودگی سے ان کا دامن پاک رکھا"۔(۳۴)

حقیقت یہ کہ علمی زندگی کے تابندہ نقوش کے ساتھ انہوں نے عملی زندگی میں تقویٰ و دیانت داری کی جو مثالیں قائم کی ہیں جدید دور میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ان کے بارے میں منتظم دفتر صدر الصدور (حیدرآباد) سید معین الدین کی زبانی یہاں تک منقول ہے کہ "حیدرآباد میں سرکاری کام مستثنیٰ کر کے اپنے خانگی و نجی کام میں شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کئے۔خود ان کی ذات تو مذکور ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر میں کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہوسکی کسی ناجائز مطلب نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا"۔(۳۵) مزید برآں ریاست حیدرآباد میں نہایت اہم منصب پر فائز رہتے ہوئے بھی ذاتی کام کے لئے سرکاری موٹر کے استعمال سے اجتناب ان کا معمول رہا ہے۔حق پسندی کا یہ عالم کہ اگر ان کے کوئی ماتحت یا دفتر کے اہلکاران کی تحریر میں کسی لفظی غلطی کی طرف متوجہ کرتے اور تحقیق پر ان کی بات صحیح معلوم ہوتی تو بخوشی ان کی اصلاح قبول کر لیتے اور اگر ریاست کا کوئی بڑے سے بڑا عہدہ دار کسی بااثر خطا کار حق میں فیصلہ کرنے یا فیصلہ تبدیل کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالتا تو ہرگز ہرگز ان کی بات کو قبول نہ کرتے اور نہ ہی فیصلہ میں کسی تبدیلی کے لئے آمادہ ہوتے۔(۳۶) ان سب باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی عملی زندگی پر قرآن و سنت کی تعلیمات کا بہت ہی گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا، وہ اس سے سمجھوتہ کرنا کبھی گوارا نہ کرتے۔ایک دفعہ حیدرآباد کی ایک مجلس میں اپنی تقریر کے دوران مولانا شروانی مرحوم نے حاضرین کو محاسبۂ نفس کی دعوت ان الفاظ میں دی تھی:

"صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئیں خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی

عادت آدمی کو انسان بناتی ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے''۔(۳۷)

واقعہ یہ کہ وہی شخص دوسروں کو محاسبۂ نفس کی دعوت دے سکتا ہے یا اسی کے لئے یہ دعوت دینا روا ہے جو خود احتسابی کا بنفس نفیس عادی ہو۔ مولانا شروانیؒ کے حالات زندگی (جیسا کہ معاصرین کے بیانات کے حوالے سے کچھ اوپر بیان کئے گئے) واضح طور پر اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ وہ اس وصف سے متصف تھے، روزمرہ زندگی میں ان کے یہاں پرہیز گاری کا اعلیٰ نمونہ ملتا ہے، احتیاط کا یہ عالم کہ قدم پھونک پھونک کر اٹھاتے تھے اور گناہ کے کاموں، بلکہ مشتبہات سے بھی اپنے کو بہت دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ یہ طرزِ زندگی انہی لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے جو اپنے اعمال کے مسلسل محاسبہ کے خوگر ہوتے ہیں اور جن کے قلوب خشیت الٰہی سے معمور رہتے ہیں۔ مولانا شروانیؒ کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے یہ الفاظ ''پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ''،(۳۸) ان کی منکسر المزاجی و متقیانہ طبیعت کے غماز ہیں۔ دیارِ شبلی کے معروف شاعر جناب یحییٰ اعظمی نے اپنی تعزیتی نظم (ماتمِ حبیبِ شبلی) میں صحیح کہا تھا:

اب کہاں اٹھتے ہیں اس وضع کے اربابِ کمال اب کہاں دولت وتقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال (۳۹)

اللہ رب العزت اس پاک طینت مولانا حبیب الرحمٰن شروانی صاحب کو کروٹ کروٹ آرام نصیب فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، اور اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی نیک خدمات سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حواشی ومراجع

(۱) مکاتیب شبلی، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ۱/ ۲۰۵۔ (۲) مکاتیب شبلی، محولہ بالا، ۱/ ۲۰۲۔ (۳) معارف، ۲۸/ ۴، اکتوبر ۱۹۳۱ء، ص ۲۹۵۔ ۳۰۹، ۳۰/ ۳، ستمبر ۱۹۳۲ء، ص ۲۱۰۔ ۲۱۲۔ (۴) محمد اکرام خاں ندوی، نواب صدر یار جنگ مرحوم کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر، دوروزہ جمہور، علی گڑھ، صدر یار جنگ نمبر، مرتبہ: عبدالشاہد خاں شروانی ر محمد ریاض الرحمٰن خاں شروانی، ۲،۲۵،۲۶ ر ستمبر ۱۹۵۱ء، ص ۲۹۔ (۵) جمہور صدر یار جنگ نمبر، محولہ بالا، ص ۳۱۔ (۶) سید معین الدین، اعتراف، معارف، ۶۶/ ۶، دسمبر ۱۹۵۰ء، ص ۴۴۵۔ (۷) عطا خورشید، علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ کتاب خانہ حبیب گنج کی روشنی میں، معارف شبلی

نمبر ۱۹۴/ ۵۔۶، نومبر۔دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۲۲۸۔۲۴۹۔ (۸) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مرتبہ: محمد عمران خاں ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ، بدون تاریخ ص ۵۔۶۔ (۹) معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۳۔ (۱۰) سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ الرحمۃ والغفران، معارف، ۶۶/ ۶، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۱۰۔۴۱۱۔ (۱۱) سید مناظر احسن، معارف، محولہ بالا ص ۴۱۱۔ (۱۲) شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ (یعنی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سوانح حیات)، مکتبہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء ص ۳۵۶۔ (۱۳) ریاض الرحمٰن خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ کی خدماتِ اردو، کانفرنس گزٹ، ۳/۷، جولائی ۲۰۰۳ء ص ۵۔ (۱۴) جمہور صدر یار جنگ نمبر، محولہ بالا ص ۳۰۔ (۱۵) میمونہ سلطان، ذکر مبارک، مطبع مسلم یونیورسٹی، ۱۹۲۷ء ص ا (دیباچہ طبع چہارم)۔ (۱۶) محمد الیاس اعظمی، آثارِ شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء ص ۲۵۲۔۲۵۳۔ (۱۷) صدر یار جنگ کی خدماتِ اردو، کانفرنس گزٹ، ۳/۷، جولائی، ۲۰۰۳ء ص ۶۔ (۱۸) حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، الفوز العظیم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء ص ۲۔۳ (دیباچہ)۔ (۱۹) الفوز العظیم، محولہ بالا، ۱۹۶۸ء ص ۱۲۔ (۲۰) ایضاً ص ۱۶۔ (۲۱) ایضاً ص ۳۲۔ (۲۲) سید سلیمان ندوی، آہ! مولانا شروانی، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۳۔ (۲۳) شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ، محولہ بالا ص ۳۶۷۔ (۲۴) تاریخ ندوۃ العلما، حصہ دوم، مرتبہ شمس تبریز خاں، دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء ص ۳۸۱۔ (۲۵) مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شروانی بنام مولانا سید سلیمان ندوی، معارف، ۷۲/۲، اگست ۱۹۵۳ء ص ۱۴۸۔ (۲۶) معارف، ۴۶/۶، دسمبر ۱۹۴۰ء ص ۴۰۴۔ (۲۷) مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شروانی بنام مولانا سید سلیمان ندوی، معارف، ۷۲/۳، ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۲۱۳۔۲۱۴۔ (۲۸) معارف، ۴۶/ ۵، نومبر ۱۹۴۰ء ص ۳۲۴۔ (۲۹) ان لکچروں کا ایک حصہ الحاج اخلاص احمد شروانی کی مرتبہ کتاب ''مولوی حبیب الرحمٰن شروانی۔حیات و علمی خدمات''، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۸ء ص ۱۳۳۔۱۳۸ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳۰) تاریخ ندوۃ العلماء، محولہ بالا، ۲/ ۹۷۔ (۳۱) سید معین الدین، اعتراف، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۵۵۔ (۳۲) معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۰۴۔ (۳۳) ایضاً ص ۴۸۴۔ (۳۴) شمس تبریز خاں، صدر یار جنگ، محولہ بالا ص ۳۶۱۔ (۳۵) سید معین الدین، اعتراف، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۴۵۔ (۳۶) سید معین الدین، اعتراف، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ (۳۷) سید معین الدین، اعتراف، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۵۶۔ (۳۸) سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ الرحمۃ والغفران، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۴۶۰۔ (۳۹) یحییٰ اعظمی، ماتم حبیبِ شبلی، معارف، دسمبر ۱۹۵۰ء ص ۵۰۰۔

استخفافِ حدیث اور حضرت ابوہریرہؓ کی کردار کشی

مولانا ذکی الرحمٰن غازی مدنی

حرفِ اول: جس زمانے میں مستشرقین نے شرقِ اوسط کے تعلق سے اپنی علمی تحقیقات و مطالعات کا سلسلہ شروع کیا تھا، اسی وقت سے ان کی کتابوں میں قرآن وسنت کی تدوین وحفاظت کے تعلق سے تشکیک وارتیاب کا رویہ پایا جانے لگا تھا۔ چنانچہ مستشرقین کی کتابوں میں ۔الا ماشاء اللہ۔ قرآن وسنت کی تاریخیت اور ثبوت کے تعلق سے کبھی کھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں طنز وتعریض اور شکوک وشبہات ابھارنے کی کوشش ضرور پائی جاتی ہے۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ قرآن الل ٹپ طریقے سے مدوّن کیا گیا تھا۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ بن عفان کے ایک سیاسی فیصلے کے بہ موجب قرآن کی تدوین عمل میں آئی اور یہ بالکل غیر منظم انداز میں اِدھر اُدھر سے اٹھا کر یکجا کیا گیا ایک چیستاں تھا۔ اس لیے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ قرآن صحیح شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ اس تہمت کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ اور اب یہی کام بہت سے مسلمان مفکرین اور دانشورانِ ملت ۔جیسے ہندوستان میں ایک ماہر دجالیات اور امریکہ میں ڈاکٹر محمد ارکون وغیرہ۔ پوری تندہی اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

اسلام کی ابتدائی صدی میں سنت نبوی کی تدوین وحفاظت کے موضوع پر عربی میں فؤاد سزکین کی موسوعاتی (انسائیکلوپیڈیائی) کتاب ''تاریخ التراث العربی'' (پہلا حصہ) بے نظیر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی کی کتاب ''دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ'' بڑی اہم اور فکر انگیز تحقیق ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی یہ کتاب پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو کیمبرج یونیورسٹی میں انھوں نے

جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ۔

تیار کیا تھا۔انھوں نے ازخوداس کا ترجمہ عربی میں کیا ہے۔اس تحقیقی کتاب میں انھوں نے گولڈزیہراور جوزیف شاخت جیسے مشہور مستشرقین کے علمی بے اصولے پن اور خیانت کو واقعاتی مثالوں کی روشنی میں مبرہن کیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ آج بھی ہمارے بہت سے روشن خیال اہل قلم ان مستشرقین کی کتابوں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔

سنت نبویؐ کی جمع وتدوین کے بارے میں مخالفین کا سب سے بڑا نشانہ وہ ناقلین ورُوات ہیں جن سے حدیثوں کی تعداد زیادہ نقل ہوئی ہے۔طبقۂ صحابہؓ میں ان کی ہرزہ سرائیوں کا نشانہ حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور طبقۂ تابعینؒ میں امام زہریؒ سے انہیں پرخاش ہے۔یہ دونوں بزرگانِ دین ایسے ہیں کہ احادیث پاک کی بہت بڑی تعداد ان کے واسطے سے نقل ہوئی ہے،اس لیے سب سے زیادہ الزامات واتہامات اور شکوک وشبہات انہی کے تعلق سے تراشے اور اٹھائے گئے ہیں۔مستشرقین کی فکری تلبیسات کو بہت سے نام نہاد مسلم مفکرین نے بھی اچک لیا اور ان باتوں کو مقامی وملکی زبان میں یوں پیش کرنے لگے گویا طویل تفتیش وتدقیق کے بعد انہیں یہ علم حاصل ہوا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ کے تعلق سے زبانِ طعن دراز کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام مصری اسکالر ''محمود ابوریہ'' کا ہے جنھوں نے ''شیخ المضیرۃ'' کے نام سے ایک پوری کتاب لکھی اور اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی شخصیت کو داغدار کرنے کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔علمانے اس کتاب کی تردید میں علمی جوابات لکھے اور ابوریہ اور ان کے مستشرق اساتذہ کے یہاں پائی جانے والی منہاجی خامیوں اور علمی بددیانتی کے رویوں کی خوب خوب نقاب کشائی کی۔ایک زمانے میں مستشرقین کے زیر اثر انکارِ حدیث کا فتنہ زوروں پر تھا اور مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے متعدد اہل قلم پوری شدومد سے ذخیرۂ حدیث کو دریا برد کرنے کی وکالت کر رہے تھے۔مگر ہر طلسم کی طرح جلد ہی اس کا زور ٹوٹ گیا اور شبہات کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔مگر فہمِ قرآن کے نام پر یہ فتنہ دوبارہ پوری تباہ کاریوں کے ساتھ کروٹیں لے رہا ہے اور ایک فکری گروہ قرآنی خدمت کی آڑ میں نوجوان نسلوں کو حدیث اور اس کی حجیت کے تعلق سے مشکوک کر رہا ہے۔کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب غالب فکر وتہذیب کے دباؤ میں کیا جا رہا ہے۔

یہاں میرے بس میں یہ تو نہیں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی پوری سیرت قلم بند کروں کیونکہ یہ اس مضمون کا موضوع نہیں اور پھر اس کام کو ایک سے زائد کتابوں میں بہ خوبی انجام دیا گیا ہے۔

مگر چونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے محبت رکھنا از روئے حدیثِ صحیح ایمان کی علامت ہے، اس لیے اپنے مومن ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اور تذکیر کے طور پر چند باتیں پیش کروں گا، حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں امام ابن خزیمہؒ کا یہ قولِ زریں ہمیشہ یادرکھنے کے لائق ہے کہ: ''حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں ان کی روایتوں کے حوالے سے وہی لوگ زبان درازی کرتے ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہے، اس لیے وہ کسی بھی حدیثِ نبوی کا معنی و مفہوم سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔''

''إنما یتکلم فی أبی هریرة لدفع أخباره من قد أعمی الله قلوبهم فلا یفهمون معانی الاخبار''

(امام حاکمؒ نے یہ قول مستدرک میں حدیث نمبر ۶۱۷۶ کے تحت درج کیا ہے۔)

تعارف: حضرت ابوہریرہؓ کا نام عبدالرحمٰن بن صخر تھا اور کنیت ابوہریرہؓ۔ آپ نام سے زیادہ اپنی کنیت سے مشہور ہوئے۔ امت نے بجا طور پر آپ کو راویۂ اسلام کا معزز لقب دیا ہے۔ قبولِ اسلام کے وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔ مشہور قول کے مطابق سن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر اسلام لائے، تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ماہِ محرم الحرام سن ۷ھ میں خیبر کی فتح کو نکلے تھے اور اگلے مہینے صفر میں خیبر کی فتح مکمل ہوئی، اس غزوہ میں حضرت ابوہریرہؓ آپ ﷺ کے ساتھ موجود تھے اور اللہ کے رسول ﷺ نے مالِ غنیمت سے ان کو حصہ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ سن سات ہجری کے آغاز میں اسلام لا چکے تھے۔ اسلام لانے کے بعد آپ پچاس سال زندہ رہے یا شاید کچھ زیادہ، کیونکہ مشہور قول کے مطابق آپ کی وفات ۵۹ھ میں ہوئی۔ ایک قول یہ بھی کہ اس سے ایک دو سال پہلے آپ کی وفات ہوئی تھی۔ اس حساب سے صرف چار سال آپ کو نبی کریم ﷺ کی صحبت ورفاقت میسر آسکی، مگر روایتِ احادیث میں آپ تمام صحابۂ کرامؓ سے آگے نکل گئے۔ مسند بقیؒ بن مخلد کے شمار کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ کی جملہ روایتوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے۔ (دیکھیں: السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی، مصطفی سباعی: ص ۳۴۲)

کثرتِ روایت کے اسباب: علم حدیث اور روایت کے میدان میں حضرت ابوہریرہؓ کے آگے نکلنے کی چند وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام لانے کے بعد آپ مستقل چار سال تک نبی کریم ﷺ کے سفر وحضر کے رفیق رہے اور بلا ناغہ مجالس میں شریک ہوتے رہے، جب کہ دوسرے صحابۂ کرامؓ کو مستقل طور سے یہ موقع نہیں مل سکا۔ اللہ کے نبی ﷺ کی صحبت دائمہ کے حصول میں اس بات سے بھی

مدد ملی کہ حضرت ابو ہریرہؓ اصحابِ صفہ اور فقرائے صحابہؓ میں شامل تھے۔ صفہ مسجد نبوی میں زیر سائبان واقع ایک خاص چبوترے جیسا حصہ تھا جو فقرائے صحابہ کا مسکن تھا اور مدینہ منورہ میں دینی تعلیم و تربیت کا یہی پہلا مدرسہ تھا۔ اس چار سالہ مختصر مدت میں حضرت ابو ہریرہؓ نے اس قدر ارشاداتِ نبویہ یاد کیے کہ صفہ کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے والے صحابۂ کرامؓ میں سب سے زیادہ حدیثِ نبویؐ کے عالم اور حافظ کہلائے۔

مزید یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علم حدیث سے آپ کی محبت دیکھتے ہوئے آپ کے حق میں برکت کی خصوصی دعا فرمائی تھی، خود حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: ''تمہارا خیال ہے کہ ابو ہریرہؓ کی رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایتیں بہت زیادہ ہیں۔ (صورتِ حال اصلاً یہ تھی کہ) میں ایک نادار شخص تھا، صرف پیٹ بھر کھانے پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ رہتا تھا، جب کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں کے کاروبار میں اور انصاری بھائی اپنی املاک و اراضی کی دیکھ بھال میں مشغول رہتے تھے۔ ایک بار میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں حاضر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کون ہے وہ جو اس وقت تک اپنی چادر پھیلائے رکھے جب تک میں اپنی بات مکمل نہ کرلوں، پھر وہ اپنی چادر سمیٹ لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ میری زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو یادداشت میں محفوظ کرنے والا بن جائے؟ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد سے خدا کی قسم، میں کبھی کچھ نہیں بھولا۔'' (إنكم تزعمون أن أبا هريرة يكثر الحديث عن النبي إني كنت امرأ مسكينا صحبت النبي ﷺ على ملاء بطني و كان المهاجرون يشغلهم الصفق فى الاسواق و كانت الانصار يشغلهم القيام على أموالهم فحضرت من النبي مجلسا فقال من بسط ردائه حتى أقضي مقالتي ثم يقبضه إليه فلن ينسى شيئا سمعه مني، فبسطت بردة عليه حتى قضي حديثه ثم قبضته إلى فوالذى نفسي بيده ما نسيت منه شيئا بعد وفى رواية فما نسيت من مقالة رسول الله تلك من شيء) (صحیح بخاریؒ، کتاب العلم، باب حفظ العلم۔ الاحکام الشرعیہ، اشبیلیؒ: ۱/۳۲۷۔ مسند البزار: ۷۶۸۹، مسند الشامیین: ۳۰۲۶، الحدیث والمحدثون، محمد ابوزہو: ص ۱۳۳)

علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ خیبر کے سال اسلام لائے اور غزوۂ خیبر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ بعد ازاں انہوں نے صحبتِ نبویؐ کو لازم پکڑا اور

طلب علم کی خاطر حاضری کی پابندی کی اور اس دوران سد رمق پر قانع رہے۔ وہ سائے کی طرح ہر وقت اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ رہتے تھے اور جہاں آپ تشریف لے جاتے وہ بھی ساتھ جاتے تھے۔ صحابۂ کرامؓ میں جو لوگ حد درجہ مضبوط اور طاقتور قوتِ حافظہ کے مالک تھے ان میں سے ایک حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ پھر وہ ایسے مواقع پر بھی موجود رہتے تھے جب کہ دیگر انصار و مہاجر صحابۂ کرامؓ حاضر نہ ہو پاتے تھے، کیونکہ مہاجرین بیع و تجارت میں مشغول تھے اور انصار کو اپنے باغات پر توجہ دینی پڑتی تھی۔ خود اللہ کے رسول ﷺ نے طلب علم اور حدیث کے تئیں ان کے شوق اور دلچسپی کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ میں بہت ساری حدیثیں سنتا ہوں اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ بھول نہ جاؤں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی چادر پھیلاؤ۔'' انہوں نے چادر پھیلائی تو آپؐ نے دونوں ہاتھ سے چادر میں کچھ ڈالا، ویسے ہی جیسے ہتھیلی میں لے کر کچھ ڈالتے ہیں، پھر فرمایا: ''اب یہ چادر سمیٹ لو۔'' حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے چادر سمیٹ لی اور اس کے بعد سے آج تک کچھ نہیں بھولا۔'' (إني قد سمعت منك حديثا كثيرا وأنا أخشى أن أنسى فقال ابسط ردائك قال فبسطته فغرف بيده فيه ثم قال ضمه فضممته فما نسيت شيئا بعد'' (الاستیعاب، ابن عبدالبر: ۴/ ۲۰۸) علامہ ابن حجرؒ نے اول الذکر حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ صدق نبوت کی علامات میں سے ایک ہے کیونکہ اس دعا کی برکت سے حضرت ابو ہریرہؓ اپنے زمانے میں حدیثیں نقل کرنے والے تمام لوگوں سے زیادہ قوتِ حافظہ والے بن گئے تھے اور طبقۂ صحابہ میں کسی دوسرے فرد سے اتنا علمی فیض اور نفع امت کو نہیں پہنچا جتنا حضرت ابو ہریرہؓ سے پہنچا ہے۔'' (تہذیب التہذیب، ابن حجرؒ: ۱۲/ ۲۶۶۔ یہی بات تھوڑے لفظی تفاوت سے انہوں نے 'الاصابۃ' میں لکھی ہے۔ دیکھیں: الاصابۃ: ۴/ ۲۰۸)

کثرتِ روایت کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ آپؓ کو علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا جس کی وجہ سے آپ ہم عصر صحابۂ کرامؓ سے آگے نکل گئے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں آپ کی تحسین فرمائی ہے۔ امام نسائیؒ نے اس سلسلے میں اپنی سنن میں ''باب العلم'' کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''ایک آدمی حضرت زیدؓ بن ثابت کے پاس آیا۔ اس نے کوئی سوال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تم ابو ہریرہؓ کے پاس جاؤ کیونکہ ایک بار میں اور جناب ابو ہریرہؓ اور ایک صاحب مسجد نبویؐ

میں بیٹھے ذکر اور تسبیح میں مشغول تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ دوبارہ دعا مانگو۔ چنانچہ ہم اور ہمارے ساتھی نے ابوہریرہؓ سے پہلے دعا مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ایک کی دعا پر زور سے آمین کہا۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ نے دعا مانگی اور انہوں نے اپنی دعا میں کہا: ''اے اللہ، میں تجھ سے وہ سب مانگتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے مانگا اور اس کے علاوہ ایسا علم مانگتا ہوں جو کبھی فراموش نہ ہو پائے۔ اس دعا پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آمین کہا۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں نے بہ یک زبان کہا: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہم بھی ایسے علم کی دعا مانگتے ہیں جو نسیان کا شکار نہ ہو پائے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دوسی لڑکا (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) اس بارے میں تم سے سبقت لے گیا۔'' (إن رجلا جاء إلى زيد بن ثابت فسأله عن شيئ فقال عليه أبا هريرة فإني بينما أنا جالس وأبو هريرة وفلان في المسجد ذات يوم ندعو الله ونذكره إذ خرج علينا النبي ﷺ حتى جلس إلينا فسكتنا فقال عودوا الذى كنتم فيه قال زيد فدعوت أنا وصاحبى قبل أبي هريرة وجعل رسول الله يؤمن على دعائنا ثم دعا أبو هريرة فقال اللّٰهم أسألك ما سألك صاحباى وأسألك علما لا ينسى فقال رسول الله آمين فقلنا يا رسول الله ونحن نسأل الله تعالىٰ علما لا ينسى فقال سبقكم بها الغلام الدوسى)، (سنن نسائیؒ: ۵۸۳۹، المعجم الاوسط، طبرانیؒ: ۱۲۲۸، مسند الحمیدیؒ: ۱۱۹۴، مستدرک حاکم: ۵۰۸/۳)

اسی طرح صحیح بخاریؒ میں ''کتاب العلم'' کے تحت ''باب الحرص على الحديث'' کے زیر عنوان یہ حدیث آتی ہے: ''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قیامت کے روز آپؐ کی شفاعت کی سعادت کن لوگوں کو نصیب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ''ابوہریرہؓ، میرا گمان تھا کہ یہ سوال سب سے پہلے تم ہی پوچھوگے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تم حدیث کے سلسلے میں سب سے زیادہ حرص وشوق رکھتے ہو۔ بہرحال میری شفاعت سے سعادت افروز وہ شخص ہوگا جس نے خلوصِ قلب یا خلوصِ نفس کے ساتھ ''لا إلٰہ إلا اللّٰہ'' کہا ہو۔'' (عن أبي هريرة قال يا رسول الله من أسعد الناس بشفاعتك يوم القيامة قال رسول الله ﷺ لقد ظننت يا أبا هريرة أن لا يسألني هذا الحديث أحد أول منك لما رأيت من حرصك على الحديث، أسعد الناس بشفاعتي يوم القيامة من قال لا إله إلا

اللہ خالصا من قلبہ أو نفسہ)۔(صحیح بخاریؒ:۹۹، ۶۵۷۰، مسند احمد بن حنبلؒ:۸۸۴۵، مسند بزارؒ: ۸۴۶۹، سنن نسائیؒ:۵۸۱۱)

حضرت ابوہریرہؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اگرچہ صرف تین سال ملی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان کے حصولِ علم کی رغبت کم نہ ہوئی اور وصالِ نبویؐ کے بعد وہ دیگر اکابر صحابۂ کرامؓ سے علمی پیاس بجھاتے رہے۔ اس طرح انہوں نے اپنا علمی دائرہ وسیع سے وسیع تر کرلیا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ ''ابوہریرہؓ علم سے بھرے برتنوں میں سے ایک بڑا برتن ہیں۔'' ''أبو هريرة وعاء من أوعية العلم''۔(مستدرک حاکم:۳/۵۰۹۔ اس روایت پر امام حاکم نے کوئی کلام نہیں کیا ہے جو دلیل ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے اور شیخین میں سے کسی ایک کے معیار پر کم ازکم پورا اترتی ہے۔ مستدرک پر نظرِ ثانی کرنے والے امام ذہبیؒ نے بھی اس پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا ہے جو ان کے طرزِ عمل کی روشنی میں دلیلِ صحت وثبوت ہے۔)

صحیح بخاری میں کتاب العلم کے تحت ایک باب حفظِ علم کے عنوان سے ہے۔ امام بخاریؒ نے اس باب میں تمام احادیث وہ رکھی ہیں جن کا تعلق حضرت ابوہریرہؓ کے حافظے سے ہے۔ شارح صحیح بخاریؒ علامہ ابن حجرؒ، امام بخاریؒ کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''امام صاحب نے اس باب میں حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ کسی کی حدیث ذکر نہیں کی۔ اس اختصاص کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ تمام صحابۂ کرامؓ میں سب سے زیادہ حدیثِ نبویؐ کے حافظ تھے۔ امام شافعیؒ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کے زمانے میں حدیثیں روایت کرنے والوں میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کے جنازے میں شرکت فرمائی تو رحمت کی دعا مانگتے ہوئے فرمایا تھا کہ انہوں نے حدیثِ نبویؐ یاد کرکے تمام مسلمانوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔'' (فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم)

ویسے تو درج بالا حدیث کی صداقت کے طور پر حضرت ابوہریرہؓ کی پوری زندگی اور ان کے ہم عصروں کی ان کے تعلق سے گواہیاں اور بعد کے ادوار میں ہر زمانے کے علماء ومشاہیر کی ان کے تئیں مدح وتحسین پیش کی جاسکتی ہے، مگر چونکہ ہمارے زمانے کے کچھ لوگوں نے دینِ اسلام کی خرابی کے لیے خاص طور سے حضرت ابوہریرہؓ کو نشانہ بنایا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کے واسطے سے مروی

احادیث کو رد کرکے اسلامی شریعت کے ایک بڑے حصے کو سبوتاژ کردیں اور پھر آسانی سے قرآن وسنت میں اپنی اور اپنے درپردہ آقاؤں کی مرضی کے مطابق تحریف وتصریف کرڈالیں۔

سطورِ ذیل میں اب ہم حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے سنت نبویؐ کے موضوع پر ابھارے گئے کچھ اشکالات کا جائزہ لیں گے۔

تعدادِ مرویات: سب سے پہلے حضرت ابوہریرہؓ سے مروی احادیث پر اعتراض دیکھیں۔ بعض معترضین کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہے۔ یہ ایک بڑی تعداد ہے۔ اس بنا پر ان احادیث کی سچائی کے تعلق سے شکوک پیدا ہوتے ہیں اور سوالات جنم لیتے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیثوں کی اتنی بڑی تعداد حضرت ابوہریرہؓ نے کیسے یادرکھی؟ کیونکہ یہ کام توصرف کمپیوٹان یعنی کمپیوٹرنما انسان کرسکتا ہے۔ تو کیا یہ مانا جائے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا دماغ کمپیوٹر کی مانند یا اس سے زیادہ تیز تھا؟ حقیقتاً یہ صرف خام خیالی اور کوتاہ فہمی پر مبنی اعتراض ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اعتراض کرنے والے کو فنِ حدیث کا کوئی تجربہ یا ذوق نہیں۔ اس غلط اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ علامہ ابن حزمؒ نے جہاں صحابۂ کرامؓ سے منقولہ احادیث کی تعداد بتائی ہے وہاں انہوں نے مکرّرات وشواہد اور تعددِ طرق کے اعتبار سے مرویات کی تعداد بیان کی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ''بقی بن مخلدؒ'' کی مسند پر اعتماد کیا ہے۔ آج یہ مسند دستیاب نہیں۔ علامہ ابن حزمؒ کی بیان کردہ تعداد دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے گمان کرلیا کہ یہ حدیثوں کی تعداد بیان ہوئی ہے، حالانکہ یہ حدیثوں کے بجائے ان کے طرق کی تعداد کا بیان ہے۔ مسند احمدؒ جو اس وقت حدیثوں کی سب سے بڑی اور جامع مسند ہے، اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی کُل روایتوں کی تعداد تیرہ سو (۱۳۰۰) سے زیادہ نہیں ہے اور یہ تعداد بھی تب ہے جب کہ ہم مکرّرات کو شمار کریں اور اس میں بھی صحیح وضعیف سب روایتیں شامل ہیں۔ اگر اس میں سے مکررات کو حذف کردیا جائے اور ان حدیثوں کو ہٹا دیا جائے جو بے حد کمزور سندوں سے پہنچی ہیں تو حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی تعداد اتنی بھی نہیں رہ جاتی۔

انفرادی احادیث: حدیثِ پاک کا استخفاف کرنے والے بعض مفکرین بڑی تمکنت اور غرور سے کہتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ابوہریرہؓ تنہا ایسی پانچ ہزار حدیثیں جانتے ہوں جو دیگر صحابۂ کرامؓ کے علم میں نہ تھیں؟ یا ابوہریرہؓ کس طرح اکیلے اس شرف سے مشرف ہوئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے منھ سے حدیثوں کی اتنی بڑی تعداد سن پائے؟ اُس وقت دیگر صحابۂ کرامؓ کہاں تھے؟ سچائی سے دیکھا جائے تو یہ اشکال بھی دلیل اس بات کی ہے کہ ان حضرات کو فنِ حدیث کی باریکیوں کا ذرّہ برابر علم نہیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جن احادیث کو بیان کیا ہے، انہیں ان کے علاوہ دوسرے صحابہؓ نے بھی بیان کیا ہے۔ صرف حضرت ابو ہریرہؓ نے اکیلے جن حدیثوں کو بیان کیا ہے اور کسی دوسرے صحابی سے وہ نقل نہیں ہوئیں، ان کی تعداد گنی چنی ہے، مشکل سے دس بیس۔ اس لیے اگر ہم حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ان تمام احادیث پر بالکلیہ خطِ تنسیخ پھیر دیں تب بھی یہ حدیثیں دوسرے صحابۂ کرامؓ کے واسطوں سے ہمیں موصول ہو جاتی ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے اپنا عجیب و غریب حاصلِ مطالعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کمپیوٹر کے ماہرین کی ایک ٹیم کے ساتھ نشست کی اور حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کو دیگر صحابہؓ کی مرویات کے ساتھ مشترکہ انداز میں کمپیوٹر پر سرچ (تلاش) کیا۔ پتہ چلا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی بیشتر مرویات کسی نہ کسی دوسرے صحابی سے بھی منقول ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی نے اپنے اس تحقیقی مطالعے کا حاصل یمن کے مقامی اخبارات میں شائع بھی کیا، بعد ازاں ایک پمفلیٹ کی شکل میں اب یہ پوری بحث مل جاتی ہے جو انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ (دیکھیں: ابوهريرة أمانة الرواية وصدقها، محمد عبده يماني، صحيفة الشرق الاوسط، عدد ۹۸۱۶ تاریخ ۱۴؍اکتوبر ۲۰۰۵ء)

اس اعتراض میں دوسری بڑی غلطی یہ ہے کہ معترض یہ سمجھتا ہے کہ صحابی جب کہتا ہے "قال رسول اللہ" تو اس کا مطلب لازماً یہ ہے کہ اس نے حدیث کو بالمشافہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہوگا۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ نااہل لوگ علمِ دین کے تعلق سے بیباکانہ رائے زنی کرتے ہیں۔ حدیثوں کا ابتدائی طالب علم بھی ان کا اعتراض سن کر مسکرا دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ صحابہؓ کی جملہ روایتیں براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہیں، بلکہ یہ انہوں نے ایک دوسرے سے سن کر بھی بیان کی ہیں۔ صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے سے روایتیں سن کر نقل کرتے تھے، بالخصوص کم عمر صحابۂ کرامؓ یا دیر سے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کا یہ عام طرزِ عمل ہے۔ معمر صحابۂ کرامؓ کی بیشتر حدیثوں کو راویوں نے انہی صغار یا متاخرین صحابہؓ کے واسطے سے اخذ کیا ہے۔ تابعین راویوں نے بھی بزرگ صحابہؓ سے سنی حدیثوں کو ان کے بجائے ان کم عمر صحابہؓ سے نقل کرنا بہتر سمجھا کیونکہ راویوں

کے نزدیک فلاں بزرگ صحابی تک جو سند جاتی ہے وہ اعلیٰ درجے کی نہ تھی۔ بزرگ صحابی کی حدیث انہوں نے کسی واسطے سے سنی تھی اور یہی حدیث کم عمر صحابی سے انہوں نے براہِ راست سن لی۔ چنانچہ براہِ راست سماعت شدہ حدیث انہوں نے اپنے تلامذہ کو بتائی۔ حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ صحابۂ کرام جب ایک دوسرے کے حوالے سے حدیث پاک بیان کرتے تھے تو واسطہ ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ بلاواسطہ کہہ دیتے تھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اسے دیکھ کر علمِ حدیث سے نابلد شخص سمجھتا ہے کہ یہ انہوں نے براہِ راست نبی کریمؐ سے سن کر بیان کیا ہے۔ صحابی کا اس طرح کسی روایت کو دوسرے صحابی سے سن کر براہِ راست اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے نقل کرنا اصطلاحاً مرسلِ صحابی کہلاتا ہے۔

اس صورتِ واقعہ کے شواہد موجود ہیں۔ حضرت براءؓ بن عازب کہتے ہیں کہ ''ہر وہ بات جو ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے تمہیں بیان کرتے ہیں ضروری نہیں کہ اسے ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم میں سے بعض نے بعض سے حدیثیں سنی ہیں۔ مگر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔'' (ما کل ما نحدثکم به عن رسول الله سمعناه بل سمع بعضنا من بعض ولکنا لا نکذب)، (العلل، احمدؒ: ۲۸۳۵، تحقیق: وصی اللہ بن محمد عباس، مسند احمدؒ: ۱۸۴۹۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مناسک حج کس طرح ادا کیے یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطے سے پہنچی ہے، حالانکہ وہ تمام ارکانِ حج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ انہیں مزدلفہ کی رات ہی میں خاندانِ عبدالمطلب کے بچوں کے ساتھ مکہ بھیج دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے بڑے بھائی فضلؓ بن عباس کی زبانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حج کی ادائیگی کا پورا حال سنا اور اسے بیان کیا۔ کتب صحاح کے راویوں نے آپ کی تفصیلی حدیث نقل کی ہے۔

اسی طرح ایک موقعے پر حضرت ابوہریرہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ جو فجر کے وقت تک ناپاک رہا، اسے روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ (من أدرکه الفجر جنبا فلا یصم) مگر بعد میں فرمایا کہ یہ حدیث میں نے حضرت فضلؓ بن عباس کے واسطے سے سنی ہے۔ (سمعت ذالك من الفضل) (صحیح مسلمؒ: ۱۱۰۹)

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بعض صحابۂ کرام ''قال رسول اللہ'' کہہ کر حدیثیں بیان

کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے پوچھا تو ان کا جواب تھا کہ مجھے یہ حدیث فلاں صحابی نے یہ کہہ کر بتائی ہے کہ اس نے اپنے کانوں سے یہ ارشادِ نبوی سنا ہے۔ گویا استفسار کیے جانے پر انہوں نے درمیانی واسطے کی صراحت کردی۔

امام ابن طاہرؒ نے ''الیواقیت الزاھرۃ'' میں لکھا ہے: ''صحابۂ کرامؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر ان کے نزدیک کوئی حدیث اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح طریقے سے پہنچ جاتی تو بغیر واسطہ ذکر کیے اسے آگے بیان کردیتے تھے۔ دیکھیے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آیتِ کریمہ ''وأنذر عشيرتك الأقربين'' کے نزول کا قصہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ دورِ اسلام کے آغاز میں سرزمینِ مکہ میں پیش آیا تھا جہاں حضرت ابوہریرہؓ موجود نہیں تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس وقت یا تو پیدا نہیں ہوئے تھے یا شیر خوار بچے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جنگِ بدر کے بعد مقتولینِ قریش کی لاشوں کو گڈھے میں پھینکے جانے اور ان کے پاس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کھڑے ہوکر بات کرنے کا واقعہ نقل کیا ہے، حالانکہ ان کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ جنگِ بدر میں شریک نہیں تھے۔ اسی طرح حضرت مسورؓ بن مخرمہ اور مروانؓ بن حکم دونوں نے صلح حدیبیہ کا واقعہ مع تفصیلات نقل کیا ہے حالانکہ دونوں کی عمر اس وقت کم تھی۔ ان کی پیدائش ہجرت کے دو سال بعد ہوئی ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک نے ہجرت سے قبل مکہ میں چاند کے دولخت ہوجانے کا واقعہ بیان کیا ہے، حالانکہ وہ مدینے میں اسلام لائے تھے۔ ان تمام صحابۂ کرامؓ کی حدیثوں کو ائمۂ محدثین نے صحیحین وغیرہ کتبِ حدیث میں درج کیا ہے اور متفقہ طور سے انہیں لائق استدلال اور قابل استشہاد مانا ہے۔'' (النكت على مقدمة ابن الصلاح، برهان الدين زركشي، تحقيق: زين العابدين فريج: ۱/۵۰۳-۵۰۵)

علومِ حدیث میں یہ ایک کثیر الوقوع امر ہے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس طرح کی حدیثوں کو علمائے حدیث نے مرسلِ صحابی کا اصطلاحی نام دیا ہے اور اس کے بہت سے شواہد و نظائر پیش کیے ہیں اور اس بنیاد پر روایات کی تقسیم اور اس کے ضمنی اثرات و نتائج نمایاں کیے ہیں۔ امام سیوطیؒ نے ''تدریب الراوی'' میں لکھا ہے: ''مرسلِ صحابی یہ ہے کہ صحابی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل یا قول کے حوالے سے ایسا واقعہ ذکر کرے جس میں وہ خود حاضر نہیں تھا، کم عمری کی وجہ سے یا دیر سے اسلام لانے کی وجہ سے۔ ایسی حدیث کو مسلکِ اصح کی بنیاد پر درست سمجھا جائے گا۔ ہمارے اصحاب اور

دیگر محدثین نے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی ہے اور وہ تمام علمائے حدیث جنہوں نے مرسل حدیث کو ضعیف کہا ہے، انہوں نے بھی بالاتفاق مرسلِ صحابی کو صحیح مانا ہے۔ صحیحین میں اس طرح کی حدیثوں کی تعداد بے شمار ہے۔ مرسلِ صحابی کو صحیح ماننے کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے سے حدیثیں نقل کرتے تھے اور وہ سب کے سب عدول ہیں۔ شاذ و نادر ہی انہوں نے غیرِ صحابی سے حدیث لی ہے، اور جب لی ہے تو صراحت کے ساتھ اسے بیان کر دیا ہے۔" (تدریب الراوی، سیوطیؒ، تحقیق: نظر الفریابی: ۱/۲۳۴)

الغرض حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے ملنے والی تمام روایات ضروری نہیں کہ انہوں نے بالمشافہ اللہ کے رسول ﷺ سے ہی انھیں سنا ہو۔ بہت امکان ہے کہ انہوں نے یہ روایتیں دیگر صحابۂ کرامؓ سے سن کر بیان کی ہوں اور چونکہ صحابۂ کرام کے دور میں سند کا کوئی سوال یا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا کیونکہ ہر صحابی ثقہ اور عدل ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے بھی درمیانی واسطوں کو ذکر کیے بغیر براہِ راست اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے سے حدیثیں بیان کر دیں۔ حضرت براءؓ بن عازب کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ سے جو حدیثیں بھی ہم تمہیں بیان کرتے ہیں وہ سب ہم نے اپنے کانوں سے نہیں سنیں، ہوا یہ کہ ہم ایک دوسرے سے حدیث سن کر بیان کرتے تھے، لیکن ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

مدتِ رفاقت: حضرت ابوہریرہؓ کے تعلق سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ کافی تاخیر سے اسلام لائے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت میں گزرا ان کا عرصۂ زندگی کافی مختصر تھا۔ ایسے میں انہیں اتنی ساری حدیثیں کہاں سے اور کیسے یاد ہوئیں؟ اس اعتراض کو کوئی جتنا چاہے علمی کہے، مگر اس میں ایک صحابیِ رسول کے تعلق سے حسد و رقابت کی بدبو چھپائے نہیں چھپ رہی۔

اللہ کے رسول ﷺ سے بڑھ کر حکیم و دانا کوئی انسان نہ ہوا۔ آپ ﷺ امت کی تعلیم و تربیت کے منصب عالی پر فائز تھے۔ آپ ﷺ کسی بھی ماہر اور مردم شناس استاد کی طرح جانتے تھے کہ کس صحابی کے اندر کس میدان کے لیے ذاتی اہلیت اور خصوصی قابلیت اور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق آپ ﷺ مختلف صحابۂ کرامؓ سے کام لیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو قیادت و مشاورت کے لیے آپؐ نے منتخب کر رکھا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی جنگی و عسکری صلاحیت

کو شایانِ شان اظہار کا موقعہ آپؐ نے فراہم کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اندر قرآن فہمی اور تفسیر کی خاص استعداد دیکھی تو اس طرف یکسوئی کا حکم فرمایا۔ حلال وحرام کے مسائل کے لیے حضرت معاذ بن جبلؓ کو سند بتایا۔ میراث اور تقسیم ترکہ کے مسائل کافی پیچیدہ ہوتے ہیں، اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو اہل پایا اور لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض صحابۂ کرامؓ کو افتا وقضا کی نازک ذمے داری سونپی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کو قرآنِ کریم کے حفظ اور اس کی قرأتوں اور لہجوں کے استقصا کے لیے خصوصی ہدایت دی۔ اسی طرح اقوالِ نبویؐ کے نقل وروایت کے لیے آپ کی نگاہِ انتخاب حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ بن مالک پر پڑی۔

ان صحابۂ کرامؓ نے وفاتِ نبویؐ کے بعد بھی اپنے اپنے میدانِ کار سے وابستگی قائم رکھی اور جو کام ان کی فطری صلاحیتوں اور خداداد لیاقتوں کے موافق تھا اور جسے ان کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید وتشجیع حاصل تھی، اس کو انھوں نے زندگی بھر اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ اس لیے ہمیں تاریخ میں یہ دیکھنے کو نہیں ملتا کہ ہر صحابی مسند تفسیر پر بیٹھا ہے یا ہر صحابی فقہ وفتوے کا کام کررہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہر صحابی نے حدیثوں کو روایت کرنے اور انہیں تابعین کو سنانے کا ذمہ بھی نہیں لیا۔ کبارِ تابعین اخذِ حدیث میں سب سے زیادہ حضرت ابوہریرہؓ پر اعتماد کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابوہریرہؓ اپنے حافظے، کثرتِ روایت اور نقلِ حدیث میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ معاصر صحابۂ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ نے بھی حفظِ حدیث کے تعلق سے حضرت ابوہریرہؓ کی مدح سرائی کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی وفات پر ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو مسلمانوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں یاد رکھتا تھا۔'' (کان ممن یحفظ حدیث رسول اللہ علی المسلمین) (طبقات ابن سعدؒ، تحقیق: احسان عباس: ۳۴۰/۴) مزید فرمایا کرتے تھے کہ ''وہ ہم سے زیادہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہنے والے اور حدیث رسولؐ کے حافظ تھے۔'' (کان الزمنا لرسول اللہ وأحفظنا لحدیثه) (سنن ترمذیؒ: ۳۸۳۶)

تابعینِ عظام بھی بہ خوبی سمجھتے تھے کہ بقیہ صحابہؓ کے اوپر حضرت ابوہریرہؓ کو حدیثوں کی باریکیاں سمجھنے اور ان میں تمیز وتفریق کرنے میں ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ ایک عجیب وغریب قصہ

اس حوالے سے امام بخاریؒ نے ’’التاریخ الکبیر‘‘ میں درج کیا ہے۔مشہور تابعی محمدؒ بن عمارہ کہتے ہیں کہ میں ایک مجلس میں پہنچا جس میں مشائخ صحابہؓ درجن سے زیادہ تعداد میں موجود تھے۔حضرت ابوہریرہؓ انھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں سنا رہے تھے۔ ہر حدیث کو ان صحابہ میں سے کچھ لوگ نہیں جانتے تھے۔چنانچہ وہ دیگر حاضرین صحابہؓ سے مراجعہ کرتے اور جان جاتے۔پھر حضرت ابوہریرہؓ اگلی حدیث سناتے اور یہی ہوتا۔ یہی ماجرا کئی بار ہوا، پس اس روز میں نے جان لیا کہ حضرت ابوہریرہؓ صحابہ میں سب سے بڑے یادرکھنے والے ہیں۔‘‘(التاریخ الکبیر، بخاریؒ:۱/ ۱۸۷)

امام شافعیؒ نے اس بارے میں لکھا ہے کہ’’حضرت ابوہریرہؓ اپنے زمانے میں حدیث کے تمام راویوں سے بڑھ کر یادرکھنے والے تھے۔‘‘(أبو هريرة أحفظ من روى الحديث في عصره) (فتح الباری،ابن حجرؒ،تحقیق:عبدالعزیز بن باز وغیرہ:۱/ ۲۱۴)اس قدر قوی حافظے کی ایک وجہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت ہے۔حضرت ابوہریرہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیثیں بھول جانے کے خدشے کا اظہار کیا تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حق میں مضبوط یادداشت کی دعا فرمائی تھی۔ اس کے بعد وہ کسی حدیث کو بھولتے نہ تھے۔دوسری وجہ یہ ہوئی کہ دیگر صحابہؓ کی طرح ان کی خانگی اور کاروباری مصروفیات نہ تھیں۔وہ ہمہ وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے اور ارشاداتِ عالیہ یاد کرتے۔اسی وجہ سے وہ حیاتِ نبوی میں فقر و مسکنت کے ساتھ رہے اور صفہ کا چبوترہ ہی ان کا گھر در تھا۔پھر دیگر صحابۂ کرامؓ کی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کوئی اضافی ذمے داری نہیں سونپی، لہٰذا وہ بالکل یکسو ہوکر احادیث کے حفظ و تلقی میں منہمک رہے۔

علاوہ بریں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی رفاقت کی مدت کچھ ایسی کم نہیں ہے۔ دنوں کے حساب سے جوڑیں تو کل چودہ سو ساٹھ (۱۴۶۰) دن وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر کے رفیق کی حیثیت سے رہے۔اگر بالفرض ہم مان لیں کہ ان کی تمام حدیثیں الگ الگ متن کے ساتھ پانچ ہزار ہیں،تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے ایک دن میں تین حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں کیں،اگر روایتِ حدیث میں ان کی خداداد صلاحیت اور اختصاصی ذوق کو پیشِ نظر رکھیں اور اس کے ساتھ یہ جوڑ لیں کہ اِن ایام میں انہیں کوئی دوسری مصروفیت۔کھانے کمانے یا اہل وعیال کی۔نہ تھی،تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کی یہ تعداد بالکل واجب اور فطری ہے،اس

میں کچھ بھی مبالغہ آمیزی نہیں۔ پھر چونکہ حضرت ابوہریرہؓ کا تخصص حدیثوں کا حفظ ونقل تھا، اسی لیے ہم ان کے تعلق سے تفسیری اقوال وآرا نہیں پاتے۔ کہتے ہوئے زبان جلتی ہے، لیکن اگر وہ واقعتاً جھوٹے تھے اور دین اور رسولؐ کے نام پر انہیں غلط سلط باتیں پھیلانے کا شوق تھا تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ہر فن میں بڑھ چڑھ کر بولتے مگر ہم ایسا نہیں دیکھتے۔ ہم پاتے ہیں کہ انہوں نے صرف حفظ حدیث اور نقلِ روایات کے میدان میں گوئے سبقت اٹھائی۔ دوسرے کسی میدان میں ان کا کوئی قابلِ ذکر وجود نہیں دکھائی پڑتا۔

اور اگر کثرتِ روایات گناہ ہے تو کیا کثرت کی بنیاد پر ہم حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر بھی اعتراض کریں گے کیونکہ دیگر صحابہؓ کے مقابلے میں ان کے تفسیری اقوال سب سے زیادہ ملتے ہیں؟ اور کیا اس بنیاد پر حضرت زیدؓ بن ثابت کو بھی متہم کرنا جائز ہوگا کیونکہ فرائض ومیراث کے مسائل میں وہ دیگر صحابہؓ کے مقابلے میں سب سے زیادہ بولتے تھے؟ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فقہ وفتوے کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے جو بقیہ صحابہؓ کی خدمات سے کافی بڑھی ہوئی ہے۔ کیا اس بنیاد پر انہیں بھی مطعون ومعتوب کیا جائے گا؟ جب کثرتِ کار کی وجہ سے کسی میدان میں بھی اس کے ماہرین کو متہم ومطعون نہیں کیا جاتا، تو آخر حضرت ابوہریرہؓ نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کا ذکر آتے ہی کچھ لوگوں کی پیشانیوں پر بل چڑھ جاتے ہیں؟ بالفرض حضرت ابوہریرہؓ کو مہلتِ رفاقت کم ملی جس کی وجہ سے ان کی مرویات کم ہونی چاہیے تھیں، مگر کیا اس بنیاد پر ہم دیگر صحابہ کرامؓ کی مرویات کو بھی مشکوک مانیں گے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تعلق صغارِ صحابہؓ کے طبقے سے ہے۔ وفاتِ نبویؐ کے وقت وہ نوعمر جوان تھے۔ اس کے باوجود ان کی مرویات کی تعداد علامہ ابن حزمؒ کے بیان کے مطابق "۲۶۳۰" تک پہنچتی ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ بھی صغارِ صحابہ میں سے تھے، مگر علامہ ابن حزمؒ کے مطابق ان کی حدیثوں کی تعداد "۲۲۸۶" تک پہنچتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی کمسن صحابی تھے اور وفاتِ نبویؐ کے وقت نوخیز لڑکے تھے، مگر امام ابن حزمؒ کے بیان کے مطابق ان کی مرویات کی تعداد ۱۶۶۰ ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے یقیناً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیرونِ خانہ زندگی کی تفصیلات کا مشاہدہ کم کیا ہوگا، اس کے باوجود امام ابن حزمؒ کے بیان کے مطابق ان کی مرویات ۲۲۱۰ ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ وہی سوال ہے جو ہمارے نام نہاد مفکرین اور منکرین

حدیث حضرت ابوہریرہؓ کے تعلق سے کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کم عمر صحابۂ کرامؓ جیسے کہ ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور انسؓ وغیرہ، اور زوجۂ رسول حضرت عائشہؓ جو زیادہ تر گھر میں رہتی تھیں، آخر ایسا کیوں ہوا کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں کی تعداد کبارِ صحابہؓ حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وغیرہ کی روایت کردہ حدیثوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے؟ اگر حضرت ابوہریرہؓ کے تعلق سے یہی سوال کر کے ان کی شخصیت کو مطعون ومشکوک کیا جاسکتا ہے تو پھر یہی سوال کر کے حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شخصیات کو کیوں داغدار نہ کیا جائے؟ اب اگر ان حضرات کے تعلق سے بھی یہ لوگ اپنا اعتراض تسلیم کرتے ہیں تو اس پر ہم یہی کہیں گے کہ ایسی مادہ پرستی اور بوالجبطی پر اللہ کی پھٹکار ہو۔

حضرت عمرؓ کی ممانعت: بعض جدید منکرین حدیث نے حضرت ابوہریرہؓ کی شخصیت مجروح کرنے کے لیے اپنی دانست میں بڑا تیر مارا اور یہ دلیل پیش کی کہ حضرت عمرؓ انھیں حدیثیں بیان کرنے سے روکتے تھے اور دھمکی دیتے تھے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو انہیں بندروں کے علاقے میں نظر بند کر دیں گے۔ عام طور پر ہمارے فکری اور علمی حلقوں میں یہ اعتراض بے سوچے سمجھے جڑ دیا جاتا ہے اور اسے بڑا وزن دار اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ بحث وتحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ معترض نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور دو خبروں یا دو روایتوں کو ایک روایت بنا کر تحریف کی ہے۔

کتب تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ارضِ قردہ میں بھیجنے کی دھمکی حضرت ابوہریرہؓ کو نہیں، بلکہ ایک تابعی کعب احبارؒ کو دی تھی، اور اس لیے دی تھی کہ وہ اہل کتاب کی کتابوں میں درج باتیں پڑھ پڑھ کر لوگوں کو بہ کثرت سناتے تھے۔ اعتراض کرنے والوں نے اپنی علمی ایمانداری کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت عمرؓ کا یہ جملہ لیا اور اسے حضرت ابوہریرہؓ پر چسپاں کر دیا۔ رہا حضرت عمرؓ کا انہیں حدیثیں بیان کرنے سے روکنا تو یہ واقعہ ابوزرعہ دمشقی نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے اور وہیں سے بعد کے مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ امام ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن زرعہ رعینی نے بیان کیا، ان سے مروان بن محمد نے اور ان سے سعید بن عبدالعزیز نے بہ واسطہ اسماعیل بن عبیداللہ نقل کیا ہے کہ حضرت سائبؓ بن یزید کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا تھا۔ وہ حضرت ابوہریرہؓ سے کہہ رہے تھے کہ یا تو آپ اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے حدیث سنانا ترک کردیں یا میں آپ کو ارضِ دوس بھیج دوں گا اور انہوں نے حضرت کعبؒ سے کہا تھا کہ یا تو تم لوگوں کو یہ باتیں بتانا بند کرو، یا میں تمہیں بندروں کی سرزمین میں پہنچادوں گا۔'' (حدثنی محمد بن زرعة الرعيني قال حدثنا مروان بن محمد قال حدثنا سعيد بن عبدالعزيز عن اسماعيل بن عبيد الله عن السائب بن يزيد قال سمعت عمر بن الخطاب يقول لأبي هريرة لتتركن الحديث عن رسول الله أو لألحقنك بأرض دوس وقال لكعب لتتركن الأحاديث أو لألحقنك بأرض القردة)۔ (تاریخ ابوزرعہ، تحقیق: خلیل المنصور: ۱۴۷۵)

یہاں ایک منطقی سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آخر اعتراض کرنے والے بھی اہل علم ہیں۔ ان سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی کہ دو خبروں کو ایک بنادیا اور جو بات کعب احبار کے تعلق سے کہی گئی تھی وہ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کردی۔ جب غلطی کی جانچ پڑتال کی جائے اور سرے سے سرا ملاتے ہوئے آخری کڑی تک پہنچا جائے تو دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے یہ نئے مفکرین ادعائے علم کے باوجود اصل مراجع کی طرف رجوع نہیں کرتے اور صرف مستشرقین اور ان کے تلامذہ کی کتابوں سے عبارتیں چن چن کر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ ان کی ذاتی تحقیق ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس دجل وتلبیس اور جعل سازی کا ارتکاب سب سے پہلے محمود ابوریہ نے اپنی کتاب ''أضواء علی السنة'' میں کیا تھا اور وہاں سے کچھ جلد باز اہل قلم۔ جیسا ڈاکٹر احمد امین۔ نے لے کر اسے اپنی تحریروں میں ذکر کردیا۔ ماہرین ومتخصصین نے اسی زمانے میں محمود ابوریہ کی غلط بیانی اور ہرزہ سرائی کا دندان شکن جواب دیا تھا۔ مگر دورِ حاضر کے مستخفین حدیث کی علمی ناواقفیت کی وجہ سے ابھی تک ان کی پھیلائی غلط بیانیاں اپنا کام کررہی ہیں۔

محمود ابوریہ کی علمی دیانت کا نظارہ دیکھنے کے لیے علامہ محدث عبدالرحمٰن معلمی کا یہ اقتباس پڑھیں: ''ابوریہ نے لکھا ہے کہ ابن عساکرؒ نے سائب بن یزیدؓ کی روایت تخریج کی ہے جس میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ یا تو تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے حدیثیں بیان کرنا بند کرو، یا میں تمہیں ارضِ دوس پہنچادوں گا یا ارضِ قردہ پہنچادوں گا۔ حوالے کے طور پر ابوریہ نے ابن کثیرؒ کی ''البدایة والنہایة'' کا نام لکھا ہے۔ مگر وہاں اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو ارضِ دوس بھیجنے کی بات کہی تھی اور کعب احبارؒ کو ارضِ قردہ بھیجنے کی بات کہی تھی۔ ابوریہ نے یہاں کعب

احبارؒ کا ذکر ساقط کر دیا اور یہ دونوں دھمکیاں یا دونوں باتیں حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتِ گرامی پر اکٹھا کر دیں۔" (الانوار الکاشفة، عبدالرحمن المعلمی: ص ۱۵۳) محمود ابوریہ نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ اس فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے دیے حوالوں کا اصل مراجع سے موازنہ کیا جائے تو بے شمار غلطیاں سامنے آتی ہیں۔ علمِ حدیث کے جن ماہرین نے ان پر نقد کیا ہے انھوں نے اس تلبیس و تدلیس سے پردہ بھی اٹھایا ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ خود محمود ابوریہ نے بھی یہاں دھوکا کھایا ہو اور اپنے مستشرقین اساتذہ سے اس طرح کی گھڑی ہوئی اور جعلی بات نقل کر دی ہو۔ شیخ مصطفی سباعیؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب "السنة ومكانتها في التشريع الاسلامی" میں مستشرقین کی اس نوع کی تلبیسات و تدلیسات کی بڑی مقدار میں عقدہ کشائی کی ہے اور "جوزیف شاخت" اور ان کے استاد "آگسٹس گولڈزیہر" کی غلطیوں اور فریب کاریوں سے قارئین کو باخبر کیا ہے۔ ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ محمود ابوریہ کی کتاب "أضواء على السنة المحمدية" کے اساسی مراجع میں مستشرق گولڈزیہر کی یہ کتاب شامل تھی۔

بہرحال اس ایک روایت کی بنیاد پر ہمارے اربابِ تجدید حضرت ابوہریرہؓ اور ان کی جملہ مرویات کو دریا برد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ یہ روایت اپنے آپ میں بے حد ضعیف ہے۔ اس میں دو علتیں ہیں۔ اول یہ کہ اس کا راوی محمد بن زرعہ الرعینی مجہول الحال اور گمنام ہے، اور دوم یہ کہ اس کی سند میں اسماعیل بن عبیداللہ اور سائبؓ بن یزید کے درمیان انقطاع پایا جاتا ہے یعنی واسطہ مفقود ہے۔ علاوہ ازیں یہ روایت کتبِ حدیث و آثار کے کسی بھی معتبر و مستند مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معتبر علماء و محدثین کے نزدیک بھی یہ روایت پایۂ اعتبار و استناد کو نہیں پہنچتی۔ بالفرض اگر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حدیثیں روایت کرنے سے روکا تھا تو اس کی وجہ کیا تھی؟ معترض کے اعتراض سے بین السطور میں لگتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوہریرہؓ کی ایمانداری پر شبہہ تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ دراصل حضرت عمرؓ تمام صحابہؓ کو بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے روکتے تھے۔ امام ذہبیؒ نے اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے تعلق سے منقول جملہ روایات و آثار کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ پھر ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا ایک اجتہادی موقف تھا۔ اس کے بالمقابل دیگر صحابہؓ کا دوسرا موقف تھا۔ امام ذہبیؒ لکھتے ہیں: "اسی طرح حضرت عمرؓ

کہا کرتے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے حدیثیں کم بیان کرو۔انہوں نے کئی بار صحابۂ کرامؓ کو حدیثیں پھیلانے سے روکا تھا۔ یہ ان کا اور ان کے علاوہ کچھ لوگوں کا موقف تھا۔‘‘ (هكذا كان عمر يقول أقلوا الحديث عن رسول الله وزجر غير واحد من الصحابة عن بث الحديث، وهذا مذهب لعمر ولغيره) (سیر اعلام النبلاء، ذہبیؒ، تحقیق: شعیب الارناؤوط وغیرہ: ۲/۶۰۱)

بیشتر صحابۂ کرام کی رائے تھی کہ ہر وہ چیز جو انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سیکھی اور سنی ہے، اسے امت تک پہنچا دیا جائے۔ ابو ہریرہؓ، انسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ اور ابو سعید خدریؓ وغیرہ مکثرین صحابۂ کرام کا یہی موقف اور اسی کے مطابق عمل تھا۔ یہی حضرات ہیں جن کی حدیثیں ہزاروں کی تعداد تک پہنچتی ہیں۔ ان کے برخلاف بعض صحابۂ کرام کی رائے تھی کہ بہ کثرت حدیثیں بیان کرنے سے دو نتائج برآمد ہوں گے۔ نمبر ایک یہ کہ تابعین کی اکثریت حدیثیں یاد کرنے اور انہیں پھیلانے میں لگ جائے گی اور نتیجے میں قرآن پر توجہ کم ہو جائے گی، بالخصوص اس لیے کہ تابعین کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو نومسلم تھے اور نمبر دو یہ کہ جب روایتوں میں توسع ہو جائے گا تو غلطی کا احتمال بھی بڑھ جائے گا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کی یہی رائے تھی۔ اسی لیے امام ذہبیؒ نے درج بالا عبارت میں اسے ان کا خاص مسلک قرار دیا ہے۔

گویا یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا جس میں صحابۂ کرامؓ کے اجتہادات مختلف تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایسا اجتہاد کیوں کیا؟ اس کا جواب ہمیں مستدرک حاکم کی ایک روایت سے بڑی حد تک مل جاتا ہے۔ اس روایت میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ’’تم لوگ کسی ایسی بستی میں جاتے ہو جہاں پر قرآن پڑھنے پڑھانے سے ویسی ہی گونج نکل رہی ہوتی ہے جیسی شہد کی مکھیوں کے چھتے سے نکلتی ہے، تم لوگ ان کے سامنے حدیثیں مت ظاہر کرو، مبادا وہ قرآن چھوڑ کر ادھر لگ جائیں۔ قرآن کو خالص رہنے دو۔ اللہ کے رسول ﷺ سے روایتیں کم بیان کرو اور آگے بڑھو، میں بھی تمہارا شریک ہوں۔‘‘ (إنكم تأتون أهل قرية لهم دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تبدونهم بالأحاديث فيشغلونكم جردوا القرآن وأقلوا الرواية عن رسول الله وامضوا وأنا شريككم) (مستدرک حاکم: ۱/۱۰۲ حدیث نمبر ۳۴۷)

ایک دوسرے واقعے میں جسے امام ابن عبدالبرؒ نے ’’جامع بيان العلم وفضله‘‘ میں نقل

کیا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: ''میں بھی سنتیں لکھنا چاہتا ہوں، مگر میں نے پچھلی امتوں کو یاد کیا جنہوں نے کتابیں لکھیں اوران میں مشغول ہوکر اللہ کی کتاب چھوڑ دی۔ اللہ کی قسم میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی دوسری چیز کو ہرگز شامل نہ ہونے دوں گا۔'' (إني كنت أريد أن أكتب السنن وإني ذكرت قوما كانوا قبلكم كتبوا كتبا فأكبوا عليها وتركوا كتاب الله وإني والله لا أشوب كتاب الله بشيئ أبدا)۔(جامع بيان العلم وفضله، ابن عبدالبر، تحقیق: ابوالاشبال الزهيري: ۳۴۳/۲۷۴/۱)

یہ وہ پسِ منظر اور حالات تھے جن کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے درج بالا موقف اختیار کیا۔ انہوں نے ترجیحی خطوط پر سوچا اور پہلے قرآن کی حفاظت اور اس کے تئیں اہتمام کو مقدم رکھا اور اس کے بعد سنت وحدیث پر توجہ دینے کی سوچی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے نومسلم گروہِ تابعین کی نفسیات کا بھی خیال رکھا مگر حضرت عمرؓ کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ سرے سے حدیثوں کو چھوڑ دیا جائے اور صحابۂ کرامؓ دین کی جو باتیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے جانتے ہیں وہ دنیا کو نہ بتائی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے خود متعدد حدیثیں نقل کی ہیں۔ علامہ ابن حزمؒ کے مطابق حضرت عمرؓ کی مرویات کی تعداد پانچ سو سینتیس ہے۔ پھر وہ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں؟

قرآن سے تعارض: ایک بات اور بھی حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کے تعلق سے بار بار کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی بہت سی احادیث صحیحین میں حدیث کے معیار کے مطابق ثابت شدہ تو ہیں مگر وہ قرآنِ کریم کی صریح آیات سے ٹکراتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی روایت کردہ یہ حدیث کہ آسمان وزمین کی تخلیق سات دن میں ہوئی۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ صحیحین میں کوئی ایسی متفق علیہ حدیث نہیں ہے جو قرآنِ کریم کے معارض ہو۔ اگر ایسی کوئی حدیث ملتی ہے تو یقینا اس کے متن کو سمجھنے میں ہم سے غلطی ہورہی ہے۔ اعتراض کرنے والے جس حدیث کی مثال دیتے ہیں، اس کے بارے میں پہلے یہ سمجھ لیں کہ وہ متفق علیہ حدیث نہیں ہے اور حدیث کی صحت وضعف کے معیاروں پر پوری اترنے والی بھی نہیں ہے۔ جمہور محدثین جیسے کہ امام بخاریؒ، علی بن المدینی، یحییٰ بن معینؒ، عبدالرحمن مہدیؒ، بیہقیؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ وغیرہ اساطین اہل علم نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے دیکھیں: مشکل حدیثیں، قرآنی تناظر میں)

اعتراض کرنے والے نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کافی مشہور ہے۔حدیث کا خلاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو سات دنوں میں پیدا فرمایا ہے۔اس طرح یہ قرآن کے ظاہری مفہوم سے ٹکراتا ہے جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارض وسماء کو چھے دن میں خلق فرمایا تھا۔امام مسلمؒ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور حفاظِ حدیث نے اس پر نقد کیا ہے۔حدیث میں علت یہ ہے کہ اس میں راوی نے غلطی سے کعب احبارؒ کے بیان کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب منسوب کر دیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے: ''صحیح مسلمؒ کی وہ حدیث جس میں ہے کہ اللہ نے تربت (؟) کو سنیچر کے دن بنایا، یہ حدیث مشہور و معروف ہے۔ائمۂ حدیث جیسے کہ بخاریؒ وغیرہ نے اس پر نقد کیا ہے۔امام بخاریؒ کا کہنا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کعبؒ کا قول ہے اور ایک موقوف روایت ہے۔امام بیہقیؒ نے یہ تعلیل قبول کی ہے۔محدثین نے اس کی غلطی بیان کی ہے۔یہ ان حدیثوں میں سے نہیں ہے جنہیں حضرت ابوہریرہؓ نے قولِ نبوی کی حیثیت سے نقل کیا ہو۔ماہرینِ فن محدثین نے امام مسلمؒ کی اس حدیث کو صحیح میں ذکر کرنے پر سرزنش کی ہے۔'' (مجموع الفتاوی: ۱۷/ ۲۳۵-۲۳۶)

''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ''صحیح مسلمؒ کے اندر بہت تھوڑے غلط الفاظ ہیں اور جن حدیثوں میں یہ ہیں قرآن کے ساتھ انہیں رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔مثلاً وہ روایت جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تربت کو سنیچر کے روز اور مخلوقات کی تخلیق کے عمل کو سات دن میں پورا کیا تھا۔(إن الله خلق التربة يوم السبت وجعل خلق المخلوقات فی الأيام السبعة) اس حدیث کے بارے میں ائمۂ حدیث یحییٰ بن معینؒ، عبدالرحمن بن مہدیؒ اور بخاریؒ وغیرہ کا ماننا ہے کہ اس میں غلطی ہوئی ہے۔یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قول نہیں ہے بلکہ امام بخاریؒ نے تو ''التاریخ الکبیر'' میں صراحت سے لکھا ہے کہ یہ کعب احبار کا قول ہے۔قرآن بھی یہ غلطی نمایاں کر دیتا ہے، اس کا بیان ہے کہ عملِ تخلیق چھے دن میں مکمل ہوا۔صحیح بخاریؒ میں یہ حدیث ملتی ہے کہ تخلیق کا آخری دن جمعہ تھا، اس طرح تخلیق کا پہلا دن سنیچر ہو جاتا ہے۔'' (الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، تحقیق: علی الناصر وعبدالعزیز العسکر: ۲/ ۴۴۳-۴۴۵)

معترض واقعتاً اگر صرف علامہ ابن القیم کی کتاب ''المنار المنیف'' دیکھ لے تو اسے پتہ چل

جائے کہ محدثین کے نزدیک احادیث کے متن کی جانچ کے اصول وقواعد کیا ہیں۔(المنار المنیف، ابن القیمؒ، تحقیق: یحییٰ الثمالی) اگر کوئی حدیث عقلِ قطعی سے ٹکراتی ہے یا قرآنی آیات کی قطعی دلالت سے متعارض ہوتی ہے تو یہ بہ ذاتِ خود ایک علتِ قادحہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں کوئی پوشیدہ کمی یا خامی ہے اور اسے دوبارہ پرکھنے کی ضرورت ہے۔

بعض صحابہؓ کی مخالفت: حضرت ابوہریرہؓ سے پرخاش رکھنے والوں کی طرف سے ایک بات بار بار دہرائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عمرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اُن پر جھوٹ کی تہمت لگائی تھی اور ان کی ایک سے زائد حدیثوں کو جعلی اور مصنوعی قرار دیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ معترض کے سامنے کون سی حدیثیں ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ مراد یہ حدیث ہے: حضرت ابوہریرہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''(نمازی کے آگے) عورت، گدھے اور کالے کتے کے گزرنے سے نماز قطع ہوجاتی ہے۔'' (يقطع الصلاة المرأة والحمار والكلب الأسود) (صحیح مسلمؒ: ۵۱۱۔ سنن ابن ماجہؒ: ۹۵۰) حضرت عائشہؓ کو جب اس حدیث کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''کیا تم نے ہمیں (یعنی عورتوں کو) کتوں اور گدھوں کے برابر کردیا ہے؟'' (أعدلتمونا بالكلاب والحمر)

حقیقتاً یہ حدیث جس پر حضرت عائشہؓ نے استعجاب ظاہر کیا ہے صرف حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے نقل نہیں ہوئی اور نہ حضرت عائشہؓ نے صرف حضرت ابوہریرہؓ پر اس تعلق سے اعتراض کیا۔ ان کا اعتراض اُن تمام صحابۂ کرامؓ کے اوپر تھا جنہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ اور حضرت حکمؓ بن عمرو۔ اس لیے اگر متہم و مطعون ہوئے تو یہ سبھی بزرگانِ دین ہوئے۔ پھر حضرت عائشہؓ کے اعتراض کی وجہ انہوں نے خود بیان فرمائی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ''تم لوگوں نے ہمیں گدھوں اور کتوں کے مشابہہ کردیا ہے۔ اللہ کی قسم، میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ نماز پڑھتے تھے اور میں ان کے اور قبلے کے درمیان تخت پر لیٹی ہوتی تھی۔ مجھے اٹھنے کی ضرورت ہوتی تھی مگر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف کے خیال سے بیٹھتی نہ تھی۔ اس لیے چپ چاپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کے پاس سے کھسک جاتی تھی۔'' (قد شبهتمونا بالحمير والكلاب والله لقد رأيت رسول الله يصلي وإني على السرير بينه وبين القبلة مضطجعة فتبدو لي الحاجة فأكره أن أجلس فأوذي

رسول اللہ فأنسل من عند رجلیہ)(صحیح بخاریؒ: ۵۱۴۔صحیح مسلمؒ: ۵۱۲)

گویا حضرت عائشہؓ کا یہ استعجاب کسی ذاتی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ایک دلیلِ شرعی کی بنیاد پر تھا۔حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی نقل و روایت کے سلسلے میں ان تمام صحابۂ کرامؓ کی توبیخ فرمائی ہے جن کی تعداد کم از کم پانچ تو ہے،اور ہوسکتا ہے دیگر بھی رہے ہوں جن کا اس پر عمل ہو،مگر انہوں نے تابعین سے یہ حدیث بیان نہیں کی۔حضرت عائشہؓ کے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کے برخلاف دلیلِ شرعی موجود ہے۔بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ اس حدیث پر نکیر کرتے ہوئے ان کے سامنے حضرت ابوذرؓ کی حدیث رہی تھی کیونکہ انہوں نے حاضرین کو اہلِ عراق کہہ کر مخاطب فرمایا ہے۔ اس بارے میں علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:''حضرت عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ عراقیو،تم نے ہمیں گدھے اور کتے کے برابر کردیا،یہ اشارہ اُس حدیث کی طرف ہے جسے عراقی راویوں نے حضرت ابوذرؓ اور دیگر صحابہؓ سے نقل کیا ہے۔''(فتح الباری:۱/ ۵۸۹)حضرت ابوہریرہؓ کے تعلق سے یہ اعتراض نقل کرنے والے کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ صحابۂ کرامؓ کے درمیان ایک اسی مسئلے میں نہیں، بلکہ کئی مسائل اور کئی حدیثوں کے بارے میں اختلافِ رائے ہوا ہے۔ ہر صحابی کا عمل اس حدیث پر ہوتا تھا جو اس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی، یا جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عمل کرتے دیکھا۔اگر اسے کسی دوسرے صحابی کی حدیث یا عمل میں ایسی کوئی بات نظر آتی جو اس کی اپنی دینی معلومات کے خلاف ہوتی تو وہ تعجب ظاہر کرتا اور اس پر برملا ٹوک دیا کرتا۔حضرت عائشہؓ نے کئی مواقع پر مختلف صحابۂ کرامؓ پر اپنی دینی معلومات کی روشنی میں اعتراض کیا ہے۔ان اعتراضات کو امام زرکشیؒ نے ایک کتاب میں یکجا کردیا ہے اور اس کا نام''الإجابة لإیراد ما استدرکته عائشة علی الصحابة''رکھا ہے۔اسی کتاب میں امام زرکشیؒ نے''یقطع الصلاة المرأة والکلاب والحمر''والی حدیث بھی نقل کی ہے اور اس حدیث کے تعلق سے صحابۂ کرامؓ کے مابین جو اختلافِ رائے ہے،اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔(دیکھیں الاجابة لإیراد ما استدرکته عائشة: ص ۱۶۱،تحقیق: سعید الافغانی) ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو تنہا حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث پر اعتراض نہیں تھا، بلکہ ان کے ساتھ کم از کم دیگر چار صحابہؓ کی حدیثوں پر بھی اعتراض تھا۔اگر اس اعتراض کی بنیاد پر کوئی فیصلہ سنانے کی کسی کو جلدی ہے تو تمام راویان صحابۂ کرامؓ کے حق میں سنائے۔بربنائے کدورت وحسد چھانٹ کر صرف حضرت ابوہریرہؓ

کونشانہ نہ بنائے۔

کعب احبارؒ سے استفادہ: حضرت ابوہریرہؓ کا کردار مشکوک کرنے کے لیے ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ بسر بن سعیدؒ نے یقین بھرے لہجے میں بتایا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک ہی مجلس میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں سنایا کرتے تھے اور اسی میں کعب احبارؒ کے بیان کردہ تاریخی قصے کہانیاں بھی سناتے تھے۔ بعض حاضرینِ مجلس باہر نکل کر دونوں طرح کی باتوں میں خلطِ مبحث کر دیتے تھے اور کسی کی بات کسی دوسرے کی طرف منسوب کر ڈالتے تھے۔

یہ بات جسے ایک الزام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اصلاً امام بسر بن سعیدؒ کی طرف سے حضرت ابوہریرہؓ کے دفاع میں کہی گئی بات ہے۔ اس طرح انہوں نے غلطی کی اصل وجہ کھولی ہے جو یہ ہے کہ کمزور حافظے کے راوی حضرت ابوہریرہؓ کی مجلس میں آتے تھے۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہی بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔ یہاں پہلے بسر بن سعیدؒ کی پوری بات سن لیجئے۔

فرماتے ہیں: ''اللہ سے ڈرو اور اچھی طرح حدیث یاد کرو، کیونکہ اللہ کی قسم میں نے دیکھا ہے کہ ہم حضرت ابوہریرہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تھے، وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کچھ حدیثیں بیان فرمادیتے، پھر کچھ باتیں کعب احبارؒ کے حوالے سے بھی سنا دیتے اور اٹھ جاتے۔ مگر میں اپنے ساتھ حاضر ہونے والے بعض لوگوں کو دیکھتا کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو کعب کی بات بنا دیتے تھے اور کعب کی بات کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بنا دیتے تھے۔'' (عن بسر بن سعید قال اتقوا اللہ و تحفظوا من الحدیث فواللہ لقد رأیتنا نجالس أبا ھریرۃ فیحدث عن رسول اللہ ویحدثنا عن کعب ثم یقوم فأسمع بعض من کان معنا یجعل حدیث رسول اللہ عن کعب ویجعل حدیث کعب عن رسول اللہ] (التمییز، امام مسلمؒ، تحقیق: محمد مصطفیٰ الاعظمیؒ: ص ۱۷۵)

دیکھیے امام بسر بن سعیدؒ نے کتنی احتیاط کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بات کہی۔ وہ صاف فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے غلطی نہیں کی۔ جو قولِ نبویؐ تھا اسے اسی حیثیت سے اور جو قولِ کعب تھا اُسے اسی حیثیت سے لوگوں کو بتایا۔ مگر حاضرینِ مجلس میں کچھ کمزور حافظے کے لوگ شامل ہوتے تھے جو دونوں طرح کی باتوں کو خلط ملط کر دیتے تھے۔ اس طرح کے ضعیف راویوں کی روایتوں کو اصلاً محدثین نے قابلِ قبول ہی نہیں مانا ہے۔ گویا امام بسر بن سعیدؒ حضرت ابوہریرہؓ سے ہمیں ہوشیار نہیں

کررہے ہیں، بلکہ ان کی روایتیں نقل کرنے والے کمزور راویوں سے خبر دار کررہے ہیں۔

عدالتِ صحابہؓ: صحابۂ کرام کی حدیثوں پر اعتراضات کرنے والے ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی کتابوں میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آتا ہے کہ یوں تمام صحابۂ کرام کو علی الاطلاق عدول ماننے کی کیا منطق ہے؟ حتی کہ کسی سند میں اگر کوئی صحابی مجہول الحال ہو تو بھی اس سے حدیث کی صحت وثقاہت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ علمِ حدیث کا اصول کیسے بن گیا ہے، حالانکہ دوسری طرف ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر صحابی معصوم عن الخطا نہیں ہے، اس سے بھول چوک، تدلیس، کتمانِ علم اور جان بوجھ کر غلطی کا صدور ممکن ہے۔ روایات کے مجموعے میں اس کی بہت ساری مثالیں بھی موجود ہیں۔ ایسے میں کیا عدالتِ صحابہؓ کے تصور پر نظر ثانی نہیں کر لینی چاہیے؟

بڑے اختصار کے ساتھ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے علاوہ حدیث کے راویوں کی ثقاہت کے سلسلے میں ہم ائمۂ جرح وتعدیل کی آرا پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب کہ صحابۂ کرامؓ جنہیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت ورفاقت کا شرف نصیب ہوا ہے اور جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کو ہم تک پہنچایا ہے، ان کی توثیق وتعدیل میں ہم قرآنی آیات اور مشہور ومتواتر احادیث پر، یعنی خود اللہ اور اس کے رسولؐ پر اعتماد کرتے ہیں اور انہی کی رو سے صحابہؓ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ائمۂ جرح وتعدیل کے مقابلے میں قرآن وسنت کا توثیقی فیصلہ زیادہ معتبر اور لائقِ اعتماد ہے۔ جرح وتعدیل کے علم کا لب لباب یہی تو ہے کہ اس میں راوی کی عدالت (یعنی کردار کی اچھائی) اور حفظ (یعنی قوتِ حافظہ) کو دیکھا جاتا ہے۔ صحابۂ کرام کی عدالت تو قرآن وسنت کی قطعی ومتواتر نصوص سے ثابت شدہ ہے۔ رہا حدیثیں نقل کرنے والے صحابۂ کرامؓ کی قوتِ حافظہ کا مسئلہ تو حدیثوں کے تعلق سے اس کا فیصلہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے راویوں کی روایات کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھا جائے۔ علمائے جرح وتعدیل کا کُل سرمایۂ علم اسی محور ومدار پر گھومتا ہے یعنی کہ مرویات کا تقابلی مطالعہ۔ اس پیمانے پر دیکھیں تو صحابہؓ میں سے کوئی ایک صحابی بھی کثیر الخطا یا کثیر الاوہام نظر نہیں آتا۔ صحابۂ کرامؓ کی حدیثیں ہمیشہ ایک معنی ومفہوم پر متفق ہوتی ہیں۔ اگر عدالتِ صحابہؓ پر ناک بھوں چڑھانے والے معترض نے ازخود یہ کام کر لیا ہوتا کہ کسی ایک صحابی کی جملہ روایتوں کو دیگر صحابۂ کرامؓ کی مرویات کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھ لیا ہوتا تو یقیناً اس کے نتائج یہی نکلتے

کہ بہ اعتبارِ حافظہ حدیثوں کے ناقلین صحابۂ کرامؓ پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ کسی صحابی کی قوتِ حافظہ پر بات کرنا اس وقت لا حاصل اور غیر واقعی وغیر عملی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کے اصول اور شریعت کے قاعدے کسی ایک صحابی کی حدیثوں پر استوار نہیں ہوئے ہیں۔ وہ تمام احادیث جن کا تعلق اسلامی اصولوں اور شرعی ضابطوں اور قاعدوں سے ہے انہیں مشاہیر صحابہؓ نے نقل کیا ہے۔ اگر ہم غیر معروف اور کم شہرت یافتہ کسی صحابی کی قوتِ حافظہ کے سلسلے میں ایک لحظہ کھٹک بھی جائیں، تب بھی حقیقت یہ ہے کہ شریعت کے اصولی احکام دیگر مشاہیر صحابہؓ کی حدیثوں کی روشنی میں ثابت شدہ اور مسلّم ہیں۔

رہا حضرت ابوہریرہؓ کی قوتِ حافظہ کا ثبوت، تو وہ اس روایت میں ملتا ہے جو امام حاکم نے اپنی سند سے ذکر کی ہے۔ جناب زعیزعہ۔ جو مروان بن حکم کے کاتب تھے۔ بتاتے ہیں کہ ایک روز مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلوایا اور مجھے تخت کے پیچھے بیٹھا دیا اور خود حضرت ابوہریرہؓ سے علمی سوالات پوچھنے لگے۔ میں حضرت ابوہریرہؓ کی بتائی ہوئی ہر حدیث لکھتا جارہا تھا۔ اس واقعے پر جب تقریباً ایک سال گزر گیا تو مروان نے دوبارہ حضرت ابوہریرہؓ کو بلایا اور اس بار مجھے ایک پردے کے پیچھے بیٹھا دیا۔ اب مروان نے پھر وہی سوالات رکھے اور حضرت ابوہریرہؓ نے پھر وہی حدیثیں سنائیں جو میرے پاس پہلے سے لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے کسی حدیث میں نہ کوئی کمی کی اور نہ اضافہ کیا، اور نہ کسی لفظ کو آگے پیچھے رکھا'' (حدثنا الزعیزعة کاتب مروان بن الحکم أن مروان دعا أبا هريرة فأقعدني خلف السرير وجعل يسأله وجعلت أكتب حتى إذا كان عند رأس الحول دعا به فأقعده وراء الحجاب فجعل يسأله عن ذالك فما زاد ولا نقص ولا قدم ولا أخر) (مستدرک حاکمؒ: ۳/ ۵۱۰۔ امام حاکمؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبیؒ نے اس سے موافقت ظاہر کی ہے۔) امام ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں یہی روایت درج کی ہے اور اس پر تبصرہ فرمایا ہے کہ ''خارقِ عادت قوتِ حافظہ اس کو کہتے ہیں۔'' پھر امام شافعیؒ کا وہی قول پیش کیا ہے جو اوپر علامہ ابن حجر نے بھی نقل کیا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/ ۵۹۸) ان کے علاوہ یہ روایت علامہ ابن حجرؒ نے ''الاصابۃ'' میں اور علامہ ابن کثیرؒ نے ''البدایۃ والنہایۃ'' میں بھی ذکر کی ہے۔ (دیکھیں الاصابۃ: ۴/ ۲۰۵، البدایۃ والنہایۃ: ۸/ ۱۰۶) وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

ملا غلام یحییٰ بہاری

مولانا طلحہ نعمت ندوی

''ملا غلام یحییٰ بہاری جن کے فلسفہ کا پڑھنا اور پڑھانا آج سو برس سے ہندوستان کے نصاب فلسفہ کا منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے، ان کی پوری سوانح عمری کا اتنا ہی حصہ معلوم ہے کہ وہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے اور شمس العلماء آزاد نے آب حیات میں مرزا جان جاناں کی لطافت طبع اور ملا غلام یحییٰ کی لمبی داڑھی کا لطیفہ سنایا ہے''۔(۱)

ملا صاحب جیسے نابغہ روزگار کے بارے میں یہ تاثر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔ ملا صاحب کے حالات کی جس کمی کا شکوہ سید صاحب نے کیا ہے وہ درست ہے، لیکن ان کی معاصر متعدد سوانحی کتابوں اور تذکروں میں ان کے حالات مختصر ہی سہی موجود ہیں، جن میں ان کے دو خواجہ تاش، مولانا غلام علی دہلوی اور مولانا نعیم اللہ بہرائچی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جنہوں نے حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناں کے حالات وملفوظات میں ان کے اجل خلفا اور مستفیدین کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے، صاحب بحر زخار وجیہ الدین اشرف قادری بھی تقریباً ہم عصر ہی ہیں، کچھ حالات واشارات ان کی تصانیف حاشیہ رسالہ میر زاہد اور کلمات الحق وغیرہ میں خود ان کے قلم سے مذکور ہیں، مولانا سید عبدالحی نے دو تین سطروں میں اپنے والد کے حوالہ سے ان کے چشم دید اور معاصر حالات نقل کیے ہیں، ان سب کے حوالے اپنی جگہ آئیں گے، لیکن پھر بھی ملا صاحب کے بہت زیادہ حالات نہیں ملتے، مولانا سید عبدالحی حسنی کے پیش نظر بحر زخار رہی ہے اور انہوں نے اسی کا حوالہ بھی دیا ہے۔

نسب: حضرت غلام یحییٰ کے والد کا نام نجم الدین ہے، جیسا کہ ان کے حاشیہ رسالہ میر زاہد کے مقدمہ میں بہ صراحت مذکور ہے، لکھتے ہیں ''فیقول العبد الضعیف الذی لا خلاق لہ من الحسنات

استھاواں (بہار شریف)۔

ولا بضاعة له الا السیئات غلام یحییٰ بن نجم الدین البھاری'' اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں ملتی، بحر زخار کے مصنف نے ان کے تذکرہ کا عنوان ''حضرت سید غلام یحییٰ بہاری'' تحریر کیا ہے، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ ان کا تعلق خانوادۂ سادات سے تھا، اور مضافات عظیم آباد میں سادات واشراف کی عام بستیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بعید از قیاس بھی نہیں، نیز حضرت مرزا مظہر جان جاناں بھی اپنی ایک تحریر میں انھیں سید لکھتے ہیں، جیسا کہ آگے تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

وطن: حضرت غلام یحییٰ کے وطن کے متعلق تذکرہ نگاروں کے بیانات مختلف ہیں، مولانا سید عبدالحی حسنی ''نزہۃ الخواطر'' میں ان کا وطن قصبہ باڑھ بتاتے ہیں اور اسی نسبت سے ان کا ذکر کرتے ہیں:

''الشیخ العالم الکبیر العلاّمة غلام یحیٰ بن نجم الدین البارھوی البھاری أحد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمة ولد ونشأ بقریة باره من أعمال بھار۔''(۲)

اس کے برعکس ''تذکرہ علمائے ہند'' کے مصنف مولانا رحمٰن علی نگرنہسہ ضلع پٹنہ (حال ضلع نالندہ) کے قریب اکیڑ نامی ایک بستی کو مولد بتاتے ہیں، اور مدفن احاطۂ درگاہ مخدوم الملک بہار شریف کو۔(۳) لکھتے ہیں: ''مولوی غلام یحییٰ بہاری مسقط راس او موضع اکیڑ متصل قصبہ نگرنہسہ از توابع بہار است کہ از بہار بفاصلہ ہشت کروہ مابین بہار و پٹنہ واقع شدہ''۔ پھر اس لفظ کے اعراب کی بھی وضاحت کرتے ہیں ''اکیڑ بکسر اول وفتح کاف عربی وسکون ہائے تحتانی معروف ورائے ہندی''(۴)

مدفن کے متعلق تو مولوی رحمٰن علی کی بات قطعی طور پر ناقابل قبول ہے، اس لیے کہ ان کے رفقا و معاصرین کی تصریح کے مطابق (جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا) ان کا مدفن مسجد ٹیلہ والی لکھنؤ ہے، مولد کے متعلق بھی ان کی بات زیادہ قابل قبول نہیں معلوم ہوتی، نیز ان کے علاوہ ان سے پہلے کے مصادر میں اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں ملتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مولوی رحمٰن علی نے کسی کی زبانی سن کر یہ بات نقل کر دی، یہ بھی ممکن ہے کہ شاید انھوں نے قصبہ ''باڑھ'' ہی سنا ہو، لیکن سننے میں غلطی ہوئی ہو، یا کتابت کی تحریر سے یہ لفظ بدل گیا ہو۔ اور اس نام کا کوئی گاؤں اس علاقہ میں معلوم بھی نہیں ہوتا، مولوی رحمان علی صاحب کے تذکرہ کی ہر اطلاع کو آسانی سے قبول کر لینا مشکل ہے، اس میں عام زبانی بیانات پر بھی اعتماد کر لیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ غلام یحییٰ کے تذکرہ میں ان مذکورہ بالا دونوں تذکرہ نگاروں کو اشتباہ ہوا ہے، اورانھوں نے ان کے ایک دوسرے ہم نام معاصر قاضی غلام یحییٰ باڑھوی کے حالات میں ان کے حالات گڈمڈ کردیے ہیں، اس اشتباہ کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ دونوں کا سن وفات بھی ایک ہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی نے گرچہ دونوں کے حالات الگ الگ ذکر کیے ہیں، لیکن صاحب تذکرہ اور قاضی غلام یحییٰ بہاری باڑھوی کے حالات ''حدائق الازہار'' (قلمی خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) کے حوالہ سے تحریر کیے ہیں، ان کے والد کا نام قاضی غلام شرف الدین از اولاد حضرت تاج فقیہ منیری لکھا ہے۔(۵)

مولانا عبدالرؤف اورنگ آبادی ندوی نے اپنے ایک مضمون میں مزید سلسلۂ نسب اس طرح ذکر کیا ہے: ''غلام یحییٰ بن غلام شرف الدین المتوفی ۱۱۴۸ھ بن ملاّ محمد رقیب ابن ملاّ عبدالعلیم یا عبدالحلیم المتوفی ۱۰۹۰ء ابن ملاّ عبدالشکور المتوفی ۱۰۳۲ھ''۔(۶)

انھوں نے مزار شریف منیر بتایا ہے، جب کہ حدائق الازہار کے حوالہ سے مولانا ابوالکلام قاسمی نے مزار احاطہ مخدوم الملک بتایا ہے۔(۷)

مختلف مقامات پر قضا کے فرائض انجام دیئے، شرح آداب المریدین مصنفہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا حاشیہ ان کی علمی یادگار ہے، جو بزرگانِ سلسلۂ فردوسیہ کے حالات میں صاحب نزہۃ الخواطر کا ماخذ ہے۔ ۴؍جمادی الاولیٰ ۱۱۸۶ھ کو وفات پائی۔(۸)

یہاں قاضی غلام یحییٰ باڑھوی کے حالات کی تفصیل کا موقع نہیں، ان کے لیے کسی مستقل مضمون کی ضرورت ہے، قاضی عبدالودود، مولوی فصیح الدین بلخی، اور مولانا عبدالرؤف ندوی اوران کے فرزند پروفیسر عبدالمغنی جیسی عظیم المرتبت شخصیات ان ہی کی نسل سے ہیں، ان کے خاندان میں ان کے جدامجد کے حالات ضرور محفوظ ہوں گے، ان کے اخلاف کا فرض ہے کہ دنیائے علم کو اپنے اس عظیم المرتبت بزرگ سے واقف کرائیں۔

تشریحات بالا سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح حضرت غلام یحییٰ بہاری اور قاضی غلام یحییٰ باڑھوی کے حالات میں خلط مبحث ہوگیا ہے، بنابریں صاحب سوانح کے مولد و وطن کے متعلق کوئی قطعی بات اس وقت تک نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ کسی علاقائی ماخذ میں اس کی صراحت نہ ملے، ممکن ہے کہ ان کا

وطن باڑھ یا نگرنہسہ ہی ہو، لیکن اشتباہ کے امکان کی بنا پر کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی، البتہ اتنا کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ان کا وطن عظیم آباد اور بہار شریف کے درمیان ہی کا کوئی شہر یا قریہ ہوگا۔

مولوی رحمٰن علی کی اطلاع بہ ظاہر نا قابل قبول ہے، اس میں ان کے مدفن کے متعلق صریح غلطی موجود ہے، نیز مولد و مدفن کی تصریح کے علاوہ ان کے متعلق اور کوئی تفصیل مولوی رحمٰن علی نے ذکر بھی نہیں کی ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر بہ ظاہر ان دونوں شخصیتوں کے فرق سے واقف معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ حاشیہ شرح آداب المریدین جو بزرگان سلسلۂ فردوسیہ کے حالات میں ان کا سب سے بڑا ماخذ ہے، حضرت غلام یحییٰ کے حالات میں وہ اس کا ذکر نہیں کرتے، لیکن باڑھ کو وہ صاحب تذکرہ کا مولد کیوں کر بتاتے ہیں؟ جب کہ دیگر ماٰخذ، جن کے حوالہ سے وہ دیگر اطلاعات ذکر کرتے ہیں، ان کے مولد سے خاموش ہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ شہرت عام اور زبانی روایت ہی کی بنا پر انھوں نے بھی یہ بات کہی ہے۔

تعلیم: حضرت غلام یحییٰ نے ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے دور کے معمول کے مطابق اودھ کا رخ کیا، اور سندیلہ (حال ضلع ہردوئی) میں مدرسہ منصوریہ میں داخلہ لے کر مولانا باب اللہ جون پوری (شاگرد ملا حمداللہ سندیلوی) سے علوم کی تکمیل کی، اس کی وضاحت خود ان کی کتاب کے مقدمہ میں ان الفاظ میں ہے: ''انی کنت قد صرف حینا من الدھر فی غوص الفرائد فی التوم والدرر بحضرۃ قاموس العلم والحکم صحاح الدرایۃ من بین الامم صراح الذکاوۃ والفطانۃ اساس الکرم والکرامۃ قمقام اذکیاء العصر ھمام کملاء الدھر فص خاتم الشریعۃ نقاد جواھر الطریقۃ باب مدینۃ العلم الاعلیٰ مولانا باب اللہ الجونفوری سلمہ اللہ تعالیٰ''۔

صاحب بحر زخار لکھتے ہیں:

> ''ابتدا از بہار پورب آمدہ از مولوی باب اللہ در سندیلہ اکتساب دانش صوری نمود۔''(۹)

ترجمہ: ابتدا میں پورب (بہار) سے آ کر سندیلہ میں مولوی باب اللہ سے ظاہری علوم کی تکمیل کی۔

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

> ''سافر للعلم فقدم سندیلۃ وقرأ الکتب الدرسیۃ فی المدرسۃ

المنصوریۃ علیٰ مولانا باب اللہ الجونفوری۔"(۱۰)

ترجمہ: علم کے لیے رخت سفر باندھا، سندیلہ آئے اور مدرسہ منصوریہ میں مولانا باب اللہ جون پوری سے درسی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد دورانِ تدریس قرآن پاک حفظ کیا، صاحب بحر زخار لکھتے ہیں:

"بہ پایۂ تکمیل رسانیدہ بتدریس اشتغال داشتہ در چند روز قرآن شریف از برکرد۔"(۱۱)

ترجمہ: درسیات کی تکمیل کے بعد تدریس میں مشغول رہتے ہوئے چند روز میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔

تدریس کا آغاز اور بیعت و استفادۂ باطنی: شیخ غلام یحییٰ نے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علوم باطنی کی تکمیل کی طرف توجہ کی، اور شاہ بدر عالم سادا موی سے بیعت ہوئے۔(۱۲)

شیخ بدر عالم بن محمد باقر قدوائی سادا موی اودھی (۱۱۸۰ھ) کا سلسلۂ طریقت شیخ پیر محمد لکھنوی سے ملتا ہے، بیچ کی کڑیاں یہ ہیں: شیخ بدر عالم، حافظ سید ابوالقاسم بجنوری، غلام نقشبند، میر محمد شفیع، پیر محمد لکھنوی۔(۱۳)

شاید اسی نسبت سے مسجد پیر محمد (جو ٹیلہ والی مسجد کے نام سے مشہور ہے) ہی میں ان کا قیام رہا اور وہیں سپرد خاک ہوئے، وہاں ایک طویل مدت تک انہوں نے تدریسی خدمت انجام دی اور اس دوران ان سے بڑی تعداد نے علمی و روحانی فیض اٹھایا۔ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے لکھا ہے

"وکان رحمہ اللہ ذا فیض و تدریس، تلمذ علیہ کثیر من الافاضل فی العلم الظاہری والباطنی"(۱۴)

روحانی کمالات اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے استفادہ: شیخ سے بیعت کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں اپنی ہر ممکن کوشش صرف کرکے فیوض و برکات اور روحانی کمالات حاصل کیے، صاحب بحر زخار لکھتے ہیں:

"پس بموجب تلقین مرشد باکتساب درویشی را مجاہدہ نمودہ صاحب مشاہدہ گشت، بہ جمعیت سنت نبویؐ را نوعے کہ بجا آوردے درزمانۂ او از دیگرے کم شنیدہ می شود۔"(۱۵)

ترجمہ: چنانچہ مرشد کی ہدایت کے بموجب درویشی کے حصول میں مجاہدہ کرکے صاحب مشاہدہ ہوگئے، اور اتباع سنت نبویؐ کی وہ مثال پیش کی کہ ان کے زمانہ میں دوسروں کے متعلق کم سننے میں آئی ہوگی۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی "مقامات مظہریہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"طریقۂ قادریہ از خدمت یکے از مشائخ آن خاندان عالی گرفتہ سالہا بہ ذکر وشغل باطنی مواظبت داشتہ، بہ صبر وقناعت واستغنا از اغنیا بسر بردہ شان دو جاہتے بہم رسانیدند۔" (۱۶)

ترجمہ: طریقۂ قادریہ اس سلسلہ کے ایک شیخ سے حاصل کیا، کئی سال تک باطنی ذکر وشغل میں مصروف رہے، اور اپنی زندگی صبر وقناعت اور امرا سے استغنا میں بسر کی، جس سے انھوں نے اعلیٰ شان اور وجاہت حاصل کی۔

ان کے دوسرے خواجہ تاش ورفیق حضرت نعیم اللہ بہرائچی بھی یہی شہادت دیتے ہیں کہ:

"وہ تقویٰ وطہارت اور اتباعِ کتاب وسنت میں راسخ قدم تھے۔" (۱۷)

طریقۂ نقشبندیہ کی تحصیل: طریقہ قادریہ کی تحصیل وتکمیل کے بعد بھی ان کی تشنگیٔ معرفت دور نہیں ہوئی اور وہ سلسلۂ نقشبندیہ کے حصول کے لیے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے، تذکروں سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنے سال لکھنؤ میں ریاضت ومجاہدہ میں صرف کیے اور کب دہلی پہنچے؟، البتہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے آخری عمر میں دہلی جانے کا تذکرہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ ان کی عمر ہی ۲۷ سال سے متجاوز نہیں ہوئی اور ان کا قیام پانچ سال وہاں رہا تو پانچ سال تک مرزا صاحب سے تعلق رہا یعنی بیس بائیس سال کی عمر میں وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے۔

ان کے خواجہ تاش حضرت شاہ غلام علی لکھتے ہیں:

"آپ (حضرت مرزا صاحب) کے کمالات نے ان کے دل میں جذبہ پیدا کردیا اور وہ ملک پورب سے آپ کے آستانۂ ولایت نشان پر حاضری کے لیے کمر بستہ ہوئے اور اس قبیلہ خدا پرستاں کی زیارت کا شرف حاصل کرکے طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا، طریقہ کے مقامات سلوک کی تحصیل پر ہمت صرف کی، چھ ماہ تک

کوئی کیفیت محسوس نہیں ہوئی، لیکن باطنی اشغال میں پیش پیش رہے............

عنایت الٰہی سے ان پر طریقہ (نقشبندیہ) کے کیفیات وارد ہونا شروع ہوگئے،

نقشبندی نسبت کے جذبات سے فائز ہوئے۔"(۱۸)

مقاماتِ مظہری کی تصریح کے مطابق وہ وہاں پانچ سال رہے۔(۱۹) لیکن اقبال مجددی صاحب نے "کلمات طیبات" (مرزا صاحب) خطوط کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ پانچ سال مسلسل نہیں رہے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی کے بیان پر حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:

"اس سلسلہ کی مختلف تحریرات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی غلام یحییٰ مسلسل پانچ سال حضرت مظہر جان جاناں کی خدمت میں نہیں رہے، بلکہ مختلف اوقات کے قیام کی مجموعی مدت پانچ سال ہوگی"۔

پھر انھوں نے ان کے رفیق حضرت مولوی نعیم اللہ کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

"درعرصہ دو نیم سال کسب کمال ایں طریقہ تاخرقہ و اجازت مطلقہ از آن جناب حاصل نمودہ باز مراجعت بہ بلدہ لکھنؤ فرمود"۔

ترجمہ: دو سال چھ مہینہ کے عرصہ میں اس سلسلہ کے کمالات حاصل کرکے اور شیخ سے خرقہ اور اجازت بیعت مطلقہ حاصل کرکے لکھنؤ واپس ہوگئے۔

پھر مجددی صاحب خود حضرت مرزا صاحب کے حوالہ سے ان کے وطن جانے کا تذکرہ کرتے ہیں۔(۲۰)

اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ مجاہدہ وریاضت کے ذریعہ نہ صرف مرزا صاحب کے خلیفہ و مجاز بنے، بلکہ ان کے منظور نظر بھی بن گئے تھے، اور بہت جلد ان کا تقرب حاصل کرلیا تھا، چنانچہ حضرت مرزا اپنے کئی مکتوبات میں ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، ایک مکتوب میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو ان کے وطن جانے کی اطلاع دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ جلد ہی ایک دو ماہ میں واپس آجائیں گے۔(۲۱)

حضرت غلام یحییٰ حضرت مرزا سے اس قدر قریب ہوگئے تھے کہ حضرت مرزا کا کھانا بھی انہی کے یہاں سے آتا تھا، جناب عبدالرزاق قریشی صاحب "کلماتِ طیبات" میں مرزا صاحب کے

ایک خط کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"خود مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ آج کل کھانا مولوی غلام یحییٰ کے یہاں سے پک کر آتا ہے، جنس یہاں سے بھیج دی جاتی ہے۔"(۲۲)

حضرت مرزا صاحب کے ان سے دلی تعلق کا پتہ ان کے ایک مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں مرزا صاحب نے ملا صاحب کی وفات پر اپنے ایک عزیز کے نام خط میں اپنے گہرے رنج کا اظہار کیا تھا۔

حضرت شاہ غلام علی تحریر فرماتے ہیں:

"آپ (حضرت مرزا صاحب) کے دل میں اس کا دکھ اور غم بیٹھ گیا، چنانچہ آپ ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "مولوی غلام یحییٰ کی رحلت سے جو زخم لگا ہے اس کے لیے مرہم نہیں ہے، ان کی وفات کے جانکاہ واقعہ سے میرے سینے میں آگ سی لگ گئی ہے، اور زہرہ آب ہوگیا ہے" إنّا لله وإنّا إليه راجعون" صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"(۲۳)

حضرت مرزا صاحب کی قدردانی کی ایک اور شہادت صاحب سوانح کا رسالہ "کلمات الحق" ہے، جو خود حضرت مرزا صاحب کی ایما پر لکھا گیا ہے، اور اس میں ان ہی کے خیالات کی ترجمانی ہے، تفصیل تصانیف کے ذیل میں آئے گی، اس کے علاوہ روحانی مقام و مرتبہ حضرت مرزا کی نظر میں ان کی علمی عظمت و منزلت اور رفعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی حسین آزاد کی غلط بیانی: مولوی حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں حضرت غلام یحییٰ کی بیعت واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مولوی غلام یحییٰ فاضل جلیل جنھوں نے "مرزا زاہد" پر حاشیہ لکھا ہے، بہ ہدایت غیبی مرزا کے مرید ہونے کو دلی میں آئے، ان کی داڑھی بہت بڑی اور گھنی تھی، جمعہ کے دن جامع مسجد میں ملے اور ارادہ ظاہر کیا، مرزا نے ان کی صورت کو غور سے دیکھا اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ بیعت کیا چاہتے ہیں تو پہلے داڑھی ترشوا کر صورت بھلے آدمیوں کی بنایئے، پھر تشریف لایئے" اللہ جمیل یحب الجمال" بھلا

یہ ریچھ کی صورت مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی تو خدا کو کب پسند آئے گی، ملاّ متشرع آدمی تھے، گھر میں بیٹھ رہے، تین دن تک برابر خواب میں دیکھا کہ بغیر مرزا کے تمہارا عقدۂ دل نہ کھلے گا، آخر بیچارے نے داڑھی حجام کے سپرد کی اور جیسا کہ خشخاشی خط مرزا صاحب کا تھا ویسا ہی رکھ کر مریدوں میں داخل ہوئے۔'' (۲۴)

لیکن یہ بات بے بنیاد معلوم ہوتی ہے، مولوی حسین آزاد کے بارے میں مولانا عبدالحی حسنی مصنف گل رعنا نے درست لکھا ہے کہ:

''آزاد نے مرزا صاحب کے حالات کے ذکر میں چٹکیاں لی ہیں اور واقعات کی صورت بگاڑ کر پیش کی ہے، بلکہ صحیح لفظوں میں مرزا صاحب کو اپنی کتاب میں بادل ناخواستہ ہی جگہ دی ہے۔'' (۲۵)

اس کے برعکس مولانا شاہ غلام علی دہلوی نے ''مقاماتِ مظہریہ'' میں لکھا ہے کہ:

''وہ (یعنی مولوی غلام محی الدین) اور مولوی غلام یحییٰ اور مولوی عبدالحق ایک ہی روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طریقہ کی طلب کا اظہار کیا، آپ نے ان دونوں بزرگوں کو تو قبول کیا (یعنی مولوی غلام یحییٰ اور مولوی عبدالحق کو) لیکن ان (مولوی محی الدین) سے فرمایا کہ تم میں وحشت معلوم ہو رہی ہے۔ (۲۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت غلام یحییٰ تنہا حاضر ہوئے ہی نہیں تھے، یہ حضرت مرزا کے جلیل القدر خلفا شاہ غلام علی اور مولوی نعیم اللہ بہرائچی کا بیان ہے جس کے مقابلہ میں مولوی حسین آزاد کے اس واقعہ کی حقیقت یا غلط بیانی واضح ہوجاتی ہے۔

مرزا صاحب کی خشخشی داڑھی کا تذکرہ مولوی کریم الدین پانی پتی نے بھی ''طبقات شعرائے اردو'' میں کیا ہے جو مولوی حسین آزاد ہی کی نقل ہے۔ (۲۷) اس لئے ان کا بیان بھی قابل اطمینان نہیں، مرزا صاحب جیسے متبع سنت کی طرف ایسے خلاف شرع عمل کا انتساب درست نہیں معلوم ہوتا، عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''کریم الدین لکھتے ہیں کہ داڑھی خشخاشی رکھتے تھے لیکن مرزا صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو سنت نبوی کا اتباع ہے، اس لیے کریم الدین کا بیان

مشتبہ ہے۔“(۲۸)

لکھنؤ کا قیام اور افادۂ خلق: صاحب ”بحرزخار“ لکھتے ہیں:

”او آخر در دہلی از مرزا مظہر جان جاناں نعمات نقشبندیہ حاصل ساختہ بہ لکھنؤ آمد، از دائرہ مزار شاہ پیر محمد لکھنوی متصل مسجد شیخ محمود قلندر کلبہ ساختہ مقیم شد، بقیہ عمر در طاعت وعبادت وتدریس طلبا واستفادہ طالبان نمودہ بسر برد۔“(۲۹)

ترجمہ: اخیر میں دہلی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے سلسلۂ نقشبندیہ کی نعمتیں حاصل کر کے لکھنؤ آئے اور شاہ پیر محمد لکھنوی کی خانقاہ سے متصل مسجد شیخ محمود قلندر کے قریب ایک ٹھکانہ پا کر مقیم ہوگئے، اور باقی عمر اطاعت وعبادت، طلبہ کی تدریس اور افادۂ خلق میں بسر کی۔

اور یہ قول حضرت شاہ غلام علی:

”وہ تعلیم طریقہ کی اجازت لے کر سالم اور بامراد اپنے وطن لوٹے، انھیں وہاں قبولیت حاصل ہوگئی، طالبوں کا ان کی طرف رجوع ہونے لگا، ظاہری علوم کا درس موقوف کردیا، باطنی احوال کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے، تنہائی میں توجہ الی اللہ کا مراقبہ کرتے، فرماتے تھے کہ باطنی نسبت کے حالات وغلبات کے ورود کی وجہ سے انھیں فرصت نہیں ملتی تھی۔“(۳۰)

حضرت موصوف افادۂ خلق میں کس قدر مصروف رہے، اور طالبان خدا کو کتنی تعداد میں ان سے فائدہ پہنچا، اس کی تفصیل نہیں ملتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افادۂ خلق سے زیادہ ریاضت وعبادت میں وقت صرف ہوتا ہوگا، نیز ان کے دونوں شیوخ بھی اس وقت تک حیات تھے، یہی وجہ ہے کہ شیخ وقت کی حیثیت سے ان کا تعارف نہیں ہوا اور نہ اس کی تفصیل ملتی ہے، لیکن دہلی سے واپسی کے بعد ان کی حالت میں بہت تبدیلی آ گئی تھی، حضرت شاہ غلام علی کے مذکورہ بالا بیان کے ساتھ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا بیان بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، وہ حاشیہ غلام یحییٰ کے اخیر میں ایک حاشیہ میں، جہاں ملا صاحب نے لکھا تھا کہ آئندہ فرصت ملی تو اس بحث کو مکمل کروں گا، اپنے والد کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”........ وترك الاشتغال بالمعقولات بالكلية حتىٰ انه لما عاد الىٰ لكهنؤ

حضر بعض طلبة العلم بهذه الحاشية المصنفه له، وسأل عن حل بعض المواضع فلم يقدر علیٰ جوابه‘‘(۳۱)

اسی کومولانا عبدالحئی حسنی ان کے حوالہ سے اپنے الفاظ میں اس طرح لکھا ہے:

’’إنه ترك الإشتغال بالمعقول قاطبة حتى إنه لما عاد إلى لكهنؤ وعرض عليه بعض الطلبة حاشيته على حاشية السيد الزاهد وسأله عن مشكلاته فلم يقدر على حلها۔‘‘(۳۲)

ترجمہ: معقولات کا اشتغال بالکل ترک کردیا، یہاں تک کہ جب وہ لکھنؤ واپس آئے اور بعض طلبہ نے ان سے ان کے حواشی پیش کر کے اس کے پیچیدہ مسائل معلوم کرنے چاہے تو وہ جواب نہ دے سکے۔

صاحب ’’بحر زخار‘‘ لکھتے ہیں کہ ’’مجرد بود‘‘ (یعنی شادی نہیں کی تھی)۔شاید علوم ظاہری و باطنی کے اشتغال اور پھر جلد انتقال کی بنا پر انھیں اس کا موقع نہ ملا ہو۔

علمی کمال اور تصانیف: حضرت غلام یحییٰ کا علمی پایہ بہت بلند تھا،ان کے رفیق و معاصر حضرت شاہ غلام علی دہلوی اور حضرت نعیم اللہ بہرائچی دونوں نے ان کی علمی عظمت کا بہت بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے،حضرت شاہ غلام علی تحریر فرماتے ہیں:

’’از اجلۂ علمائے تحریر وزبدۂ فضلائے خوش تقریر بمکارم صفات موصوف بودند،حفظ قرآن مجید نمودہ،بدرس علم ظاہری پرداختند ،بر کتب علوم معقول حواشی مفید نوشتہ اندر طبعے رسا ذہنے درغایت ذکاء داشتند۔‘‘(۳۳)

ترجمہ: جلیل القدر عالم اور خوش تقریر فاضل تھے، اعلیٰ صفات سے متصف تھے، قرآن مجید حفظ تھا، ظاہری علوم کے درس میں مصروف رہے،علم معقول کی کتب پر مفید حواشی لکھے،طبیعت رسا اور ذہن انتہائی تیز تھا۔(۳۴)

حضرت مولوی نعیم اللہ لکھتے ہیں:

’’مولوی غلام یحییٰ کو درسی علوم میں کمال حاصل تھا، وہ تمام کتابوں کا درس عمدگی سے دیتے تھے۔‘‘(۳۵)

صاحب "بحر زخار" نے بھی ان کی تعریف میں بڑے جامع الفاظ لکھے ہیں:

"جامع علوم صوری و معنوی...... صاحب عجائب اطوار و غرائب آثار، بر ہر علم و کسب کہ قصد کردے بانصرام رسانیدے۔"(۳۶)

ترجمہ: صوری و معنوی علوم کے جامع اور عجیب وغریب کمالات وخصوصیات کے حامل تھے، جس علم کے حصول کا بھی قصد کر لیتے، اس کو انجام تک پہنچاتے۔

ان کا اصل موضوع اور ان کا علمی میدان علوم عقلیہ تھا، اسی میں ان کی شاہکار تصنیف حاشیہ میر زاہد نے اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کیا، اسی لیے مولانا عبدالحی حسنی نے بھی انھیں "أحد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیة" لکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم نقلیہ میں انھیں دسترس نہیں تھی، حضرت مرزا صاحب نے ان سے نظریۂ وحدۃ الوجود پر کلمات الحق لکھوائی تھی، یہ خود ان کے علم باطن اور شرعی علوم میں کمال کی واضح شہادت ہے۔ حضرت غلام یحییٰ کی تین کتابیں اہل علم کے نزدیک متعارف ہیں، "کلمات الحق، حاشیہ سلم العلوم، حاشیہ میر زاہد" ہیں۔

کلمات الحق: یہ کتاب درحقیقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوب مدنی کا جواب ہے، جس میں شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریہ کے مطابق وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے جمع وتطبیق کا نظریہ پیش کیا گیا ہے، حضرت مولوی نعیم اللہ بہرائچی کے بہ قول:

"حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ایما پر ایک رسالہ "کلمات الحق" کے نام سے لکھا، جس میں وحدت وجود اور وحدت شہود کے مسئلہ پر بحث کی ہے، خود مرزا صاحب نے اس رسالہ کو پڑھ کر چند سطریں بطور اظہار خوشنودی لکھیں۔ مرید ہونے کے علاوہ مولوی غلام یحییٰ نے یہ رسالہ چونکہ مرزا صاحب کے ایما پر لکھا تھا، اس لیے وہ بڑی حد تک مرزا صاحب کے خیالات کا پرتو ہیں۔"(۳۷)

اس کا مقدمہ خود حضرت مرزا صاحب کے قلم سے ہے جس میں صاحب کتاب کی تعریف میں انھوں نے بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں، حضرت شاہ غلام علی نے مقامات مظہریہ میں یہ پورا مقدمہ نقل کیا ہے، مقامات مظہریہ کے اردو ترجمہ سے یہ پوری تقریظ نقل کی جاتی ہے۔

حضرت مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"نحمد اللہ و نصلی علی رسولہ سرگروہ علمائے فحول اور جامع معقول و منقول سید غلام یحییٰ أو صلہ اللہ إلی ما یتمنی جو نسبت اخوت طریقت اس ہیچ مداں یعنی جاناں سے رکھتے ہیں، میرے ایما پر مسئلہ وحدت الوجود و وحدت الشہود کے بیان میں ایک مختصر رسالہ لکھ کر مجھے دکھایا، حق بات یہ ہے کہ اختصار کے باوجود انھوں نے پورے موضوع کا احاطہ کرلیا ہے، جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء لیکن مسئلہ تطبیق سے الجھنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ مکشوفین کے درمیان تطبیق کا مسئلہ تکلف سے خالی نہیں ہے، لیکن اس سے ایک اچھی مصلحت وابستہ ہے، ھی الإصلاح بین الفئتین العظیمتین، رحم اللہ عبداً انصف ولم یتعسف والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔"(۳۸)

شیخ کے قلم سے ان کے لیے "جامع معقول و منقول" کے جامع الفاظ ان کے علوم عقلیہ و نقلیہ پر مکمل دسترس کے شاہد ہیں۔

صاحب کتاب نے اس کتاب پر جو مقدمہ تحریر کیا ہے، وہ بھی بہت اہم ہے، اختصار کے باوجود اس سے حضرت مرزا صاحب اور مصنف کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

"ان مطالب کا راقم فقیر غلام یحییٰ جو علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد چند طلبہ کے ساتھ لکھنؤ میں تدریس میں مشغول رہا، عرض کرتا ہے کہ اس کے اندر حق طلبی کی اہمیت پیدا ہوئی اور ارادۂ دلی اس پر غالب ہوا، توفیق نے حضرت مرزا جان جاناں سلمہ الرحمٰن کی خدمت میں پہنچایا، دہلی میں حضرت عالی مرتب کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہوکر طریقۂ عالیہ مجددیہ کی تحصیل میں سرگرم رہا، ساتھ ساتھ اس مرجع اہل فضل و کمال سے عقلی و نقلی مسائل میں بھی نئی تحقیقات اور نادر دقائق کے فیوض و برکات حاصل ہوئے، اور کبھی حضرت کی ایما پر ان کے حسب الحکم فقیر نے بھی بعض مقدمات خدمت عالی میں پیش کیے اور ان کو شرف قبولیت حاصل ہوئی، ان ہی مسائل میں توحید وجودی و شہودی کے مسئلہ میں گفتگو ہوئی، اور اس باب میں محققین و

متقدمین صوفیہ کے اختلافات سامنے آئے، اور اکثر فقیر کو ان مطالب کے قلمبند کر لینے اور ان مباحث کی تلخیص درج کر لینے کا اشارہ ہوتا، فقیر نے حضرت کے حسب الحکم ۱۱۸۴ھ میں اس رسالہ کی تالیف کی توفیق پائی جو دو مسئلوں، ایک تبصرہ اور ایک تکملہ پر مشتمل "کلمات الحق" کے نام سے موسوم ہے۔"(۳۹)

اس رسالہ میں چونکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نظریہ کی تردید تھی، اس لیے ان کے فرزند گرامی حضرت شاہ رفیع الدین نے "دمغ الباطل" کے نام سے عربی مخلوط فارسی میں اس کے رد میں ضخیم کتاب لکھی، جو مولانا عبدالحمید سواتی کی تحقیق و ترتیب سے آراستہ ہوکر ادارہ نشر و اشاعت نصرۃ العلوم گوجرانوالہ (پاکستان) سے شائع ہوگئی ہے، اور تقریباً دو سو سے زائد صفحات کو محیط ہے۔ جس میں شروع میں "کلمات الحق" بھی شامل ہے۔

جناب اقبال مجددی لکھتے ہیں:

"رسالہ کلمات الحق کے مندرجات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل شاہ ولی اللہ کے رسالہ تطبیق وحدت الوجود والشہود (مکتوب مدنی) کے جواب میں لکھا گیا ہے، حضرت شاہ رفیع الدین نے اس کا جواب دمغ الباطل کے نام سے لکھا۔"

آگے لکھتے ہیں:

"مسئلہ وحدت الوجود والشہود کو اس دور کے مصنفین نے خاصا الجھا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی دو فعال ترین شخصیتیں یعنی شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر اس معاملہ میں خاصے متفکر نظر آتے ہیں، حضرت مظہر نے اپنے مکاتیب میں بھی اس موضوع پر خاصی جامع و مدلل بحث کی ہے، نیز انھوں نے شیخ قمرالدین اورنگ آبادی سے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ لکھوایا، جس کا نام "مظہر النور" (عربی) ہے۔"(۴۰)

حضرت شاہ غلام علی دہلوی اس کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"راقم کہتا ہے کہ ان دونوں مسئلوں پر تطبیق کرنا محال ہے، کیوں کہ دونوں مسئلے الگ الگ مقام کے مقتضی ہیں، لیکن درحقیقت ان دونوں مشارب میں نزاع نہیں ہے۔ اگر کسی نے طریقہ مجددیہ کی علم و وجدان کے ساتھ سیر کی ہو تو اس پر اس کا

مفہوم واضح ہے۔‘‘(۴۱)

حضرت غلام یحییٰ کی دوسری تصنیف ’’حاشیہ میر زاہد‘‘ ہے، جس کا نام لواء الہدیٰ فی اللیل والدجیٰ ہے، یہ کتاب ایک زمانہ تک نصاب فلسفہ کا منتہائے کمال سمجھی جاتی رہی، اور درحقیقت یہی کتاب ہے، جس نے انھیں شہرت عام اور بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز کیا ہے، آج علمی حلقوں میں ان کی یاد اسی کتاب کی رہین منت ہے، گرچہ یہ کتاب عرصہ ہوا نصاب سے خارج کردی گئی ہے اور اب نہ فلسفہ کا وہ عام مذاق ہے نہ اس کی ضرورت، لیکن ہندوستان کی علمی تاریخ میں اسے جو مرتبہ حاصل ہے، وہ کتاب و مصنف دونوں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے، افسوس کہ اب ایسے ماہرین فن نہیں، جو اس کی امتیازات و خصوصیات پر سیر حاصل بحث کریں، جس کی بنا پر کتاب علمائے ہند کا مرکز توجہ بنی، اور طلبا نے اسے حرز جان بنایا، اور متعدد علما نے خود اس حاشیہ کی شرح و توضیح میں حصہ لیا۔ شاید درسی ضرورت ہی کی وجہ سے اس حاشیہ کی بھی متعدد شروحات منظر عام پر آئیں، ان میں سے چند کے نام مؤرخ ہند مولانا سید عبدالحی حسنی کے حوالہ سے ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

میر زاہد ہروی نے قطبی کے مبحث علم پر ایک حاشیہ تحریر کیا تھا، حضرت غلام یحییٰ نے اس پر ’’لواء الہدیٰ فی اللیل والدجیٰ‘‘ کے نام سے حاشیہ لکھا۔

اس کتاب پر درج ذیل حواشی لکھے گئے:

پہلا حاشیہ از شیخ تراب علی لکھنوی، دوسرا حاشیہ مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا عبدالحق خیر آبادی کے اسی حاشیہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی اور ان کے درمیان معرکہ آرائی شروع ہوئی، چنانچہ مولانا فرنگی محلی نے اس پر الگ الگ چار حواشی لکھے۔ ہدایۃ الوریٰ، مصباح الدجیٰ، علم الہدیٰ، نور الہدیٰ۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کس بحث پر اس علمی ردوقدح کا آغاز ہوا، ابتدا کس کی جانب سے ہوئی، آیا مولوی عبدالحق خیر آبادی نے اس کا کوئی جواب دیا یا نہیں، بہ ظاہر مولانا عبدالحی کے پہلے حاشیہ لواء الہدیٰ المسمیٰ بمصباح الدجیٰ پر مولانا فضل حق نے اعتراض کیا تھا، اس کا جواب نور الہدیٰ میں دیا اور اس کے ساتھ اس پر بھی ایک حاشیہ علم الہدیٰ کے نام سے لکھا گیا، اس کے آغاز میں حضرت فرنگی محلی نے لکھا ہے:

’’فھذا تعلیق اجد سمیته بنور الھدیٰ لحملة لواء الھدیٰ علقته علیٰ

بعض مواضع لواء الھدیٰ مما کثر فیہ الشغب وزلت فیہ الاقلام ۔(۴۲)

اور اس کے اوپر عنوان میں نور الھدیٰ لحملۃ لواء الھدیٰ مع تعلیقاتہ علم الھدیٰ تحریر ہے۔

ان کے علاوہ شیخ اصغر علی فیض آبادی، مولانا سعید حسرت عظیم آبادی اور مولانا محمد احسن گیلانی (جد بزرگوار مولانا سید مناظر احسن گیلانی) نے بھی حواشی لکھے۔"(۴۳)

ہمیں اس کتاب کے انہی حواشی کا علم ہے۔

اسی طرح علم معقول میں ان کا تیسرا کارنامہ ان کے ہم وطن بزرگ قاضی محب اللہ بہاری کی "سلم العلوم" پر ایک حاشیہ ہے۔

وفات: حضرت غلام یحییٰ کی وفات بہت کم عمری میں ہوئی، عین عالم شباب میں اس نابغۂ روزگار کی موت نے ان کے احباب و شیخ سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، حضرت مرزا ان کی وفات پر اپنے خط میں جس طرح خون کے آنسو روئے ہیں، وہ ان کے الفاظ میں اوپر گذر چکا ہے۔ صاحب بحر زخار نے ان کی عمر صرف ۲۷ سال لکھی ہے اور سن وفات ۱۱۸۰ھ لکھا ہے لیکن صحیح ۱۱۸۶ھ ہے، جیسا کہ ان کے رفیق حضرت نعیم اللہ بہرائچی نے لکھا ہے، صاحب بحر زخار کے الفاظ میں:

"آخر در تاریخ ماہ ذی قعدہ وسنہ یک ہزار یک صد و ہشتاد بعمر بست و ہفت سالگی وفات نمودہ بدائرہ شاہ پیر محمد مدفون شد۔"(۴۴)

ترجمہ: آخر ماہ ذی قعدہ ۱۱۸۰ھ میں ۲۷ سال کی عمر میں وفات پا کر خانقاہ شاہ پیر محمد میں مدفون ہوئے۔

حضرت شاہ غلام علی تحریر فرماتے ہیں:

"ان کی عمر نے وفا نہ کی، ان کے قادری سلسلہ کے شیخ بیمار ہوئے، ان کے سلب مرض کے لیے توجہ کی تو شیخ کا مرض ان میں منتقل ہو گیا اور اسی مرض میں آپ انتقال کر گئے۔"(۴۵)

اقبال مجددی صاحب نے حضرت غلام یحییٰ کا سن وفات پوری تحقیق سے ان کے رفیق شیخ نعیم اللہ کے حوالہ سے ۱۱۸۶ھ ثابت کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مولوی غلام یحییٰ کے سال وفات میں تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے،
صاحب ''نزہتہ الخواطر'' نے بہ حوالہ ''بحر زخار'' ۱۱۸۰ھ لکھا ہے اور مولوی رحمٰن علی نے
۱۱۲۸ھ (ص:۲۷۱) لیکن ہم عصر مؤلف نعیم اللہ بہرائچی نے ۱۱۸۶ھ لکھا ہے۔

''درحین حیات آن حضرت درسنہ ہزار وصد وہشتاد وشش ہجری در محروسہ لکھنؤ
وفات یافتند۔'' (بشارات ورق:۱۹۴/۱)

اس سن کی تصدیق خود حضرت مظہر کے اس مکتوب سے بھی ہوتی ہے۔

''مولوی غلام یحییٰ کی وفات کے داغ کا کوئی مرہم نہیں۔'' (مجموعہ خلیق انجم:۳۰)

''مولوی غلام یحییٰ کی خبر جانکاہ نے سینے میں آگ لگادی۔''

ان دونوں مکاتیب کا سن تحریر ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء ہے، جس سے حتمی طور پر ان کا سال وفات ۱۱۸۶ھ ہی قرار پائے گا، تکیہ شاہ پیر محمد لکھنوی (ٹیلہ والی مسجد) میں مدفون ہوئے''۔(۴۶)

ممکن ہے کہ صاحب ''بحر زخار'' سے لفظ شش چھوٹ گیا ہو، ویسے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی عبارت اوپر گذر چکی، اس میں انہوں نے بھی ۸۰ھ ہی لکھا ہے اور مولوی رحمٰن علی کا بیان تو قابل اعتنا ہی نہیں۔
حضرت غلام یحییٰ اپنے بزرگان سلسلہ اور شیخ المشائخ پیر محمد لکھنوی کے قریب ہی مدفون ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ پرآشوب میں تمام قبروں کے نشانات مٹ گئے، صاحب ''بحر زخار'' کی تصریح کے مطابق اگر ان کی وفات ۲۷ رسال کی عمر میں ہوئی تو اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۱۵۹ھ مطابق ۴۶-۱۷۴۵ء قرار پاتا ہے۔(۴۷)

حوالے

(۱) نقوش سلیمانی، ص ۴۰۴، مطبوعہ اعظم گڑھ، اول۔ (۲) نزہتہ الخواطر (الاعلام بمن فی الھند من الاعلام) مطبوعہ بیروت دار ابن حزم ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء ص:۸۰۷۔ (۳) تذکرہ علمائے ہند فارسی، ص ۱۵۹، مطبع منشی نول کشور، اول، سنہ ۱۸۹۴ء۔ (۴) حوالہ سابق۔ (۵) تذکرہ علمائے بہار مطبوعہ پٹنہ جلد اوّل ذکر قاضی غلام یحییٰ (غ)، ملا غلام یحییٰ کے بارے میں ایک رائے مولوی کریم الدین علوی میر دادی کی بھی ہے، انہوں نے اپنی کتاب مخزن الانساب (مطبوعہ پٹنہ) میں بہار شریف کے محلوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں محلہ مرار پور کے ذکر میں لکھا ہے کہ ملا غلام یحییٰ جن کا حاشیہ مشہور ہے وہ اسی محلہ کے تھے جو اخیر عمر میں اپنی سسرال باڑھ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں وفات پائی، لیکن ان کی

اطلاع بھی دوسرے ملا غلام یحییٰ ہی کے بارے میں ہوگی، حاشیہ میر زاہد کا ذکر ان کی غلطی ہے اور دیگر اطلاعات بھی زبانی روایات پر مبنی اور قابل تحقیق ہیں۔(۶) معارف اگست ۱۹۵۸ء مضمون ''مکتوبات مظہر بلخی اور سلطان غیاث الدین بنگالہ۔''(۷) تذکرہ علمائے بہار۔(۸) حوالہ سابق۔(۹) بحر زخار از وجیہ الدین اشرف و قادری الہٰ آبادی (قلمی مخزونہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جلد اوّل حصہ دوم ورق: ۴۳۴)۔(۱۰) نزہتہ الخواطر۔(۱۱) حوالۂ بالا بحر زخار۔ (۱۲) مقاماتِ مظہری اردو ترجمہ و تحشیہ از اقبال مجددی، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۲ء ص:۴۱۷ (حاشیہ) بہ حوالہ بشارات مظہر یہ از مولوی نعیم اللہ بہرائچی (قلمی)، بحر زخار حوالہ بالا، نزہتہ الخواطر، حوالہ بالا۔(۱۳) مقامات مظہری (حاشیہ ص:۴۱۷) بہ حوالہ مخزن برکت۔(۱۴) لواء الہدیٰ فی مصباح الدجیٰ ص ۲۱۶ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۷ھ (۱۵) بحر زخار، حوالہ بالا۔(۱۶) مقامات مظہری، ص:۹۳ (فارسی) مطبع مجتبائی دہلی۔(۱۷) مقاماتِ مظہری اردو ترجمہ از اقبال مجددی، ص:۳۸۵۔(۱۸) بشارات مظہر یہ بہ حوالہ مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام از عبدالرزاق قریشی مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔(۱۹) مقاماتِ مظہری اردو ترجمہ از اقبال مجددی، ص:۳۸۵۔(۲۰) حوالہ سابق، ص:۴۱۷۔(۲۱) مقامات مظہری مترجمہ اقبال مجددی میں ملا صاحب کے حالات میں میں اس کی تفصیل دیکھیے۔ (۲۲) مرزا مظہر اور ان کا کلام بہ حوالہ بالا، ص:۱۱۰۔(۲۳) مقاماتِ مظہری، ص:۳۸۶ و مجموعہ خطوط مرزا صاحب، مرتبہ خلیق انجم۔(۲۴) آب حیات، ص:۱۲۰ مطبوعہ کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۸ء۔(۲۵) گل رعنا، ص:۱۲۸ مطبوعہ اعظم گڑھ۔ (۲۶) مقاماتِ مظہری بہ حوالہ بالا، ص:۳۸۷۔(۲۷) طبقات شعراء، بہ حوالہ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر اور ان کا کلام، ص:۱۰۷۔(۲۸) مرزا مظہر اور ان کا کلام، ص:۸۷۔(۲۹) بحر زخار، حوالہ بالا۔(۳۰) مقامات مظہری، ص:۳۸۵۔(۳۱) لواء الھدیٰ فی اللیل والدجیٰ، ص ۲۱۶ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۷ھ۔(۳۲) بہ حوالہ نزہتہ الخواطر۔(۳۳) بحر زخار بہ حوالہ بالا۔(۳۴) اکثر مقامات مظہری کی عبارتوں کے ترجمے اس کے اردو ترجمہ (اقبال مجددی) سے ماخوذ ہیں، کہیں کہیں تبدیلی بھی کی گئی ہے۔(۳۵) مرزا مظہر از عبدالرزاق قریشی۔(۳۶) بحر زخار بہ حوالہ بالا۔(۳۷) مرزا مظہر از عبدالرزاق، ص:۹۹۔(۳۸) مقامات مظہری، ۳۸۶۔(۳۹) حوالۂ سابق حاشیہ بہ حوالہ کلمات الحق قلمی، ص:۴۱۸۔(۴۰) حوالہ سابق۔(۴۲) نور الہدیٰ لحملۃ لواء الہدیٰ از مولانا عبدالحی فرنگی محلی مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۳۲۹ھ (۴۳) ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون، مطبوعہ دارالمصنّفین ۱۹۶۹ء، ص:۳۵۳-۳۵۲۔ (۴۴) بحر زخار بہ حوالہ بالا۔(۴۵) مقامات مظہری۔(۴۶) حوالۂ سابق۔(۴۷) ملا صاحب کے حالات پر راقم نے چند سال قبل المجیب (پھلواری شریف پٹنہ) میں بھی ایک مضمون تحریر کیا تھا لیکن اس وقت تمام مصادر تک رسائی نہیں ہوسکی تھی، نیز بہت سی اغلاط بھی راہ پا گئی تھیں اب مباحث کی توسیع کے ساتھ ان سب کی تصحیح کی گئی ہے۔

اخبار علمیہ

''بین المذاہب عبادت گاہ کمپلیکس کا قیام''

بین المذاہب ہم آہنگی، رواداری اور اتحاد باہمی کی ترویج وفروغ کے لیے متحدہ عرب امارات میں ایک ایسا کمپاؤنڈ زیر تعمیر ہے جہاں مسجد، صومعہ اور کلیسا تینوں عبادت گاہیں ہوں گی، العربیہ نیوز کے مطابق یہ تینوں عبادت گاہیں حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی ہیں جو الہامی دین کی حامل ہیں۔ ابوظبی میں واقع جزیرۂ سعدیات میں اس وقت حضرت ابراہیمؑ کے نام پر ایک گھر بھی تعمیر کیا جارہا ہے، یہ کمپلیکس ۲۰۲۲ء میں مکمل ہوگا۔ اس میں روزانہ عبادات، مذہبی تقریبات، مختلف النوع پروگراموں اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد ہوگا۔ یہاں یہودیوں کے بعض تاریخی نوادر اور مقدس مقامات بھی ہیں۔ اجازت ملنے کے بعد ان کے دید سے شرف اندوز ہونے کے لیے اسرائیل اور دنیا بھر میں مقیم یہود متحدہ عرب امارات کا رخ کر سکتے ہیں۔ ابوظبی میں لوفرے میوزیم میں توریت کا نادر یمنی نسخہ موجود ہے جو صنعاء میں دریافت ہوا تھا۔ اس کے علاوہ عبرانی زبان میں بائبل کا ایک نسخہ بھی ہے۔ برج خلیفہ، جزیرہ پام جمائزہ اور دبئی فریم جیسے مقامات سیاحوں کے لیے بڑی کشش کا سامان رکھتے ہیں۔ (صحافی دکن، حیدرآباد، ص ۷، ۲۹ راگست ۲۰۲۰ء)

''لاشوں کو نئے ملبوسات پہنانے کی رسم''

مرحومین سے محبت اور ان کے لیے ایصال ثواب کا رواج اور انداز دنیا کے تقریباً ہر خطہ اور ہر قوم میں موجود ہے، لیکن اس ضمن میں یہ خبر دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ انڈونیشیا کی بعض قومیں اپنے آباواجداد کی روحوں کے اعزاز و یاد میں ہر سال اگست کے مہینہ میں ایک رسم کے تحت لاشوں کی صفائی اور انہیں دوبارہ لباس پہنانے کے لیے اپنے گھروں یا قبرستانوں میں جمع ہوتے ہیں۔ جنوبی سلویسی میں نورگتوراجا اور پینگالا میں تورجا برادری خاص طور سے اس کو تہوار کے طور پر مناتی ہے۔ لاشوں کو کفن سے نکال کر انہیں صاف کرنا، ان کے ساتھ بات کرنا حتیٰ کہ انہیں سگریٹ پلانا اس رسم کا

خاص حصہ ہے، تورجا قوم میں موت کی رسموں کو زندگی کا سب سے بڑا جشن اور زندگی اور موت کے درمیان تعلق کو لامحدود سمجھا جاتا ہے۔ اہل خانہ اکثر مرحومین پر ماتم کرتے، مہینوں اور کبھی کبھی تو سالوں ان کی لاشوں کو گھر میں رکھتے ہیں۔ یہ روایت تورجا قوم کی ثقافت کا خاص حصہ ہے جو مذہباً پروٹسٹنٹ عیسائی ہے۔ (سیاست، حیدرآباد، ص ۹، ۲۷/اگست ۲۰۲۰ء)

''مترجم فیس ماسک''

ایک جاپانی کمپنی صرف آلۂ مترجم بنانے میں مصروف ومنہمک تھی کہ کووڈ-۱۹ کی وبا نے پوری دنیا کو دیکھتے دیکھتے اپنی چپیٹ میں لے لیا اور اس کمپنی نے اپنے منصوبہ کا رخ فیس ماسک کی جانب پھیر دیا۔ خبر کے مطابق کمپنی نے ایک ایسا فیس ماسک تیار کیا ہے جو سماجی فاصلہ کے وقت آواز کو بڑھا اور آٹھ زبانوں میں ترجمہ کرسکتا ہے۔ یہ ایپ کے ذریعہ کام کرتا ہے اور آپ کی باتوں کا آٹھ زبانوں ہسپانوی، فرانسیسی، چینی، کوریائی، ویت نامی، انڈونیشیائی، انگریزی اور جاپانی کو ایک دوسرے میں ترجمہ کرسکتا ہے، ماسک میں سامنے کی جانب سانس لینے کے لیے سوراخ بنائے گئے ہیں جن کا اصل کام ترجمہ اور آواز کو بڑھا کر پیش کرنا ہے۔ اس ماسک کو پلاسٹک اور سیلکون سے بنایا گیا ہے۔ اس میں ایک جدید ترین مائیکرو چپ ہے جو پہننے والے کے اسمارٹ فون سے بلیوٹوتھ یا وائی فائی سے جڑ سکتی ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ مترجم ماسک ایسے سیاحوں کے لیے بنایا گیا ہے جو ایرپورٹ پر زبان نہ جاننے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ (صحافی دکن، حیدرآباد، ص ۴، ۸ ستمبر ۲۰۲۰ء)

''صدیوں پرانے نقوش قدم کی دریافت''

معروف سائنسی تحقیقی جریدہ ''سائنس ایڈوانسز'' میں شائع شدہ نتائج تحقیق کے مطابق سعودی عرب کے صحرا میں ماہرین کو ایک لاکھ بیس ہزار برس پرانے انسانی قدموں کے نشانات ملے ہیں۔ یہ انکشاف لاکھوں سال پہلے زمین پر انسانی نقل وحرکت کے متعلق نئے حقائق سامنے لاسکتا ہے۔ ارضیاتی اور ماحولیاتی تاریخ کے ماہر سائنس دانوں نے ان نشاناتِ قدم کی قدامت کی تصدیق بھی کردی

ہے۔ یہ نشانات قدم سعودی عرب کے شمال میں صحرائے نفود کے علاقہ میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہ انسانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ایک ایسے سفر کی نشاندہی کرتے ہیں جو اپنے جانوروں کے ساتھ پانی کی تلاش میں چھوٹی چھوٹی جھلیوں کے پاس رک بھی جایا کرتا تھا۔ اس سائنسی مطالعہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ موجودہ سعودی عرب کے اس علاقہ میں انسان ایسے سفر کرتے تھے کہ ان کے ساتھ اونٹ، بھینس اور ایسے ہاتھی بھی ہوتے تھے جو آج کل کے جانوروں کے مقابلے میں کہیں بڑے ہوتے تھے۔ رپورٹ کے مطابق اس زمانہ میں ممکن ہے انسان بڑے بڑے ممالیہ جانوروں کا شکار بھی کرتے رہے ہوں لیکن اس وقت کسی بھی جگہ زیادہ دیر تک انسان قیام نہیں کرتا تھا۔ اس کا طویل قیام وہیں ہوتا تھا جہاں پانی موجود ہے۔ (انقلاب وارانسی، ص ۱۲، ۱۹ر ستمبر ۲۰۲۰ء)

''اینٹی سولر پینل کی ایجاد''

سائنس دانوں نے رات کے وقت بجلی پیدا کرنے والے اینٹی سولر پینل ایجاد کر لیے ہیں۔ سولر پینل سورج کی روشنی سے ٹھنڈے ہو کر اس سے بجلی بناتے ہیں، جب کہ اینٹی سولر پینل رات کے وقت زمین سے نکلنے والی ریڈایشن سے ٹھنڈے ہوتے ہیں اور اس سے بجلی بناتے ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رات کو زمین کی تابکاری سے توانائی حاصل کرنے کے اخراجات کم کیے جاسکتے ہیں اور یہ ٹکنالوجی قطب شمال کے قریب واقع علاقوں میں جہاں نصف سال شب کا بسیرا رہتا ہے، بہت کارآمد ہوسکتی ہے۔ اس تحقیق سے وابستہ سائنس داں لنکلنگ فیئر کا کہنا ہے کہ اس نظام کی مدد سے چلتی ہوئی کاروں سے ضائع ہونے والی توانائی کو بھی بچا کر بجلی بنا سکتے ہیں۔ اسٹین فورڈ یونیورسٹی اور ٹیکنو اسرائیل انسٹی ٹیوٹ کے محققین کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ نتائج تھرمو الیکٹرک جنریٹر میں بہتری پیدا کر کے حاصل کیے ہیں۔ ان کے مطابق اب یہ پینل فی مربع میٹر ۲ء۲ واٹ توانائی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ پرانے پینل کے مقابلہ میں ۱۲۰ فیصد اضافی بجلی ہے۔ اس ٹکنالوجی کے حصول میں بازار میں موجود پرزے اور متعلقہ ٹکنالوجی استعمال ہوئی۔ تاہم ابھی اس پر تحقیقات جاری ہیں۔ یہ تحقیق آپٹک ایکسپریس نامی جریدہ میں شائع ہوئی ہے۔ (تاثیر، پٹنہ، ۳ ستمبر ۲۰۲۰ء، ص ۷)

(ک۔ص۔اصلاحی)

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا عبدالسلام ندوی کی تین نادر غزلیں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی شمیم (۱۸۸۳-۱۹۵۶ء) تعلیم کی غرض سے بچپن میں آگرہ اور کانپور میں اپنے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن کلیمؒ (۱۸۶۸-۱۹۲۵ء) کے ساتھ رہے۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی صحبت میں مولانا بھی داد سخن دینے لگے اور انہی سے تلمذ اختیار کیا۔ مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی غزلیں "پیام یار" اور "دامن گلچیں" وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ چنانچہ مولانا نے بھی ان گلدستوں میں اشاعت کے لئے اپنی غزلیں بھیجیں اور شائع ہوئیں۔ اس وقت مولانا مرحوم کی عمر ۱۵-۱۶ر سال تھی۔

امیر مینائی (۱۸۲۹-۱۹۰۰ء) کا مشہور گلدستہ "دامن گلچیں" ایک نایاب گلدستہ ہے۔ گذشتہ دنوں اتفاقیہ اس کے چار شمارے (فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۸۹۹ء) ہاتھ آگئے۔ اس کے تین شماروں میں مسلسل مولانا مرحوم کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ غزلیں چونکہ ان کے عہد شباب کی یادگار ہیں اور مجموعہ کلام "مکاتیب و اشعار مولانا عبدالسلام ندوی" مرتبہ پروفیسر کبیر احمد جائسیؒ میں شامل بھی نہیں ہیں۔ اس لئے قارئین معارف کی نذر کی جاتی ہیں۔

(۱)

للہ آج رخ سے نہ پردہ اٹھایئے — کچھ یاد ہے کہ کل سر بازار کیا ہوا

اس کے بھی چومنے سے خفا ہوگئے حضور — یہ سنگ در بھی آپ کا رخسار کیا ہوا

بیتاب ہو کے لے لیا بوسہ تو بولے وہ — حق میں مرے بلا ہوئی یہ پیار کیا ہوا

میں جی اٹھا جو سن کے مری موت کی خبر — بولے وہ ہائے میرا وفادار کیا ہوا

گھبرائے پھرتے ہیں یہ جناب شمیم کیوں — محشر میں گرم یار کا دربار کیا ہوا

(دامن گلچیں، فروری ۱۸۹۹ء، ص ۱۱)

(۲)

شب فرقت کی تاریکی بھی آفت ہے معاذ اللہ
رقیب روسیہ کے منہ سے بھی کم بخت کالی ہے

مئے گلگوں کی رنگت سے عجب عالم ہے بوتل کا
فرشتے کہتے ہیں یہ نور کے سانچے میں ڈھالی ہے

خدا جانے یہ کیسا رنگ ساقی نے بھرا اس میں
کہ تصویر اس کی کچھ اس سے بھی بڑھ کر بھولی بھالی ہے

نکالا شوخیوں نے جب حیا کو ان کی آنکھوں سے
تو عصمت نے کہا ہے ہے بڑے نازوں کی پالی ہے

شب فرقت بھی میری دیکھ کر شرمائی جاتی ہے
تمہارے گیسوؤں کی رات دنیا سے نرالی ہے

مرے انکار مے نوشی پہ ان کا طنز سے کہنا
چھکتے اس طرح ہیں گویا زہر کی گویا پیالی ہے

شمیم اس گل نے جب دیکھا اسے یوں ہنس کے فرمایا
غزل یا دامن گلچیں میں یہ یہ پھولوں کی ڈالی ہے

(دامن گلچیں، مارچ ۱۸۹۹ء، ص ۱۷۔۱۸)

(۳)

گر آبلہ پا کی یہی ہے مرے گرمی
کانٹوں کی زبانوں پہ بھی پڑ جائیں گے چھالے

رکھتے نہیں آئینہ وہ پاس اب دم زینت
ڈرتے ہیں کہیں عکس نہ انداز اڑا لے

یہ ضعف کا عالم ہے ترے عشق میں ظالم
رہ رہ گئے آ آ کے لبوں تک مرے نالے

ہر اک تری رفتار کے فتنوں سے ہے نالاں
دن رات کیا کرتی ہے پازیب بھی نالے

کیا گرمی خورشید قیامت کا مجھے ڈر
آنچل مرے سر پر تری رحمت تو ہے ڈالے

دن کو جو ہیں کعبے میں تو بت خانے میں شب کو
ہیں ڈھنگ شمیم آپ کے دنیا سے نرالے

(دامن گلچیں، مئی ۱۸۹۹ء، ص ۱۲)

وفیات

یادِ رفتگاں

محرم کو گئے صرف ایک مہینہ ہوا، لیکن موت و زندگی اور اس کی پائیداری و ناپائیداری سے نوحہ و ماتم کا ایک شور مسلسل ہے، کیسے کیسے کمالات کے پیکر، خاک میں مل گئے اور جاتے جاتے رخصت کرنے والوں کو بتا گئے کہ موت کا راز نہاں کچھ اور ہی ہے، یہ تو زندگی کی حقیقتوں کی تجدید کا دوسرا نام یعنی خواب کے پردے میں بیداری کا ایک پیغام ہے۔کورونا کا عذاب کیا کم تھا، اس پر فضل و کمال کے الفاظ کو معانی عطا کرنے والوں کا اس طرح دنیا کی نگاہوں سے غائب ہونا قیامت ہے۔بس یہی ایک حقیقت کی تکرار دل و دماغ کی زبان پر ہے کہ زندگی ایک متاع درد کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پروفیسر فضل امام، شاہ ہلال احمد قادری، امین عثمانی ندوی، سید سراج الحسن مجددی اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، اب کس دل سے ان کے ناموں کے آگے مرحوم لکھا جائے، علم، فضل، ادب، تحقیق سب سوگوار ہیں، یہاں ان مرحومین کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

پروفیسر فضل امام

یکم ستمبر کے اخبار سے خبر ملی کہ پروفیسر فضل امام نے لکھنؤ میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، وہ الہ آباد یونیورسٹی کے موقر استاد رہے، اچھے نقادوں میں ان کا شمار تھا، عمدہ مقرر تھے، کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان خوبیوں کے علاوہ ان کی شرافت، وضع داری اور ایک خاص تہذیبی رکھ رکھاؤ ان کو اکثروں سے الگ اور ہجوم میں ممتاز بناتا تھا، شبلی کالج میں یوم شبلی پر وہ اکثر مدعو کیے جاتے اور شبلی سے عقیدت ان کو یہاں بار بار کھینچ لاتی، شبلی کے ذکر میں وہ بے خود سے ہو جاتے، ان کی تقریروں میں اردو سے محبت اور اس کی اہمیت کا ذکر تو ہوتا ہی تھا، اسلام کو انہوں نے جس طرح سمجھا اس کو سمجھانے کی ان کی ادا بھی بڑی خاص تھی، انہوں نے منشی امیر اللہ تسلیم جیسے کامل الفن، استاد ملوک اور صوفی شاعر کا اپنے تحقیقی مقالے کے لیے انتخاب کیا تھا، اب یہ حسن اتفاق ہی ہے کہ تسلیم، علامہ شبلی کے محبوب تھے، اتنا کہ ایک زمانہ میں انہوں نے اقتدائے تسلیم میں اپنا تخلص تسنیم رکھ لیا تھا، فکر و نظر کی یہی ہمواری تھی کہ پروفیسر فضل امام اس حلقہ سخن میں بھی بڑی تمکنت سے دیکھے گئے جو اقبال سے منسوب اور نکتہ ہائے خودی سے معمور ہے، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''علامہ اقبال کی اساس فکر'' کے نام سے چھپا، اہل بیت کی محبت، اسداللہی اور شبیری، حیدری و کراری، مولا علی خیبر شکن، پنجہ حیدر، مقام حیدر، بازوئے حیدر، ظرف حیدر، صبر حسین جیسے

اوصاف و تلمیحات سے کلام اقبال کی روح میں جھانکنے کی یہ کوشش محض شاعرانہ ضرورت نہیں تھی، پروفیسر صاحب کے الفاظ میں غیر جانب دار ہوکر کھلے دل و دماغ سے اس کا مطالعہ علامہ اقبال کے گہرے شعور و فکر کا نتیجہ قرار پاتا ہے، فکر و نظر کی پاکی ہی تھی جوان کو میر درد اور میر انیس کے شعری ایوانوں تک لے گئی، لیکن وہ محض قدامت و روایت کے اسیر نہ تھے، احتشام حسین اور جدید اردو تنقید ان کے مطالعہ کی وسعت کی غماز ہے، وہ احتشام حسین کو حالی کے خانہ میں رکھتے تھے اور اس طرح ان کی مارکسیت اور ترقی پسندی یا جدیدیت کے بالواسطہ منکر تھے، کہیں کہیں تو وہ براہ راست اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ تفہیم ادب کے لیے جدیدیت، مابعد جدیدیت، پس مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات جیسے مباحث سے ادب اور تنقید دونوں کا زیاں ہوا، یہ تنقید صرف خود کو متعارف کرانے کے لیے ہے، اس سے ادب کا تعارف و تفہیم ممکن نہیں، ۱۹۴۰ء میں اعظم گڑھ کے ایک موضع بہاء الدین پور میں پیدا ہوئے، اکبر پور، فیض آباد، الٰہ آباد اور لکھنؤ تک کے سفر کی کل مدت اسّی سال رہی، خدا آخرت کا سفر بھی آسان فرمائے۔

مولانا شاہ ہلال احمد قادری

ایام عاشورہ کے جاتے ہی پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ کے علمی و عملی ترجمان بلکہ خانقاہ کے سلف صالحین کے نہایت روشن اور حقیقی عکس شاہ ہلال احمد قادری بھی شفق ہستی میں چھپ گئے اور کہنے والے کہتے رہ گئے ع: اے مہ نو ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے۔

الفت دیرینہ تو اس آسمان سے بھی ہے جو خانقاہ مجیبیہ کے نام سے علم و عرفان کی دنیا پر صدیوں سے سایہ فگن ہے، حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری کے ذریعہ جب مشیت الٰہی نے بہار میں شریعت و معرفت کے ایک مرکز کی بنا ڈالی تو جیسے عام خانقاہوں سے الگ اس خانقاہ کی شناخت بھی مقرر کردی گئی، مولانا مناظر حسن گیلانی نے کبھی لکھا تھا کہ اس خانقاہ سے جو ''رہ قلندر'' نکلی وہ دراصل ''مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست'' سے پھوٹی ہوئی کرن ہے، کبھی دارالمصنّفین میں شاہ نصر احمد پھلواروی مرحوم اس خیال کی عملی تصویر تھے اور آج جن کا ماتم ہے وہ بھی اسی تصویر کے مثنی تھے، شاہ ہلال احمد قادری کو عمر اپنے مثنی سے کچھ زیادہ ملی، ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوئے، اس طرح کل تریسٹھ سال کی عمر پائی اور اس عرصہ میں انہوں نے عالم، معلم، مصنف، محقق، خطیب و مصلح ہر طرح سے اپنی زندگی کے ہر باب کو ایسی سرخی اور ایسا نقش دیا جو تابندہ تر اور پائندہ تر ہی بنتا رہا، ان کی تعلیم و تربیت کا کیا کہنا، جن بزرگوں کے زیر سایہ پلے بڑھے ایک امت کے لیے ان کی تمنا ہی کافی ہے،

۱۹۷۷ء میں ظاہری علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو دوسروں کی معلمی کا وقت آیا، ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور دیکھتے دیکھتے صحیحین کے مقام تدریس پر پہنچ گئے، یہ بھی معلوم ہوا کہ درسیات سے فراغت کے بعد حفظ قرآن کی نعمت بھی حاصل کرلی، علوم ظاہری و باطنی کا اجتماع یا امتزاج، خانقاہ مجیبیہ کے سر کا تاج ہے، ہمارے ہلال صاحب نے بھی سیر منازل کی اور خوبی سے طے کی، تصنیف و تالیف کا شغل بھی روایات دیرینہ کی پاسداری کا گواہ بنا، مزاج محض تقلیدی نہیں تھا، اس لیے جو لکھتے تحقیق کا حق ادا کرنے کا جذبہ بھی اس میں شامل ہوتا، ان کی کئی کتابوں کا ذکر معارف میں بھی آیا، سوانح مولانا شاہ امان اللہ قادری، سیرت پیر مجیب، خانوادہ سیدہ زینب، نغمات الانس فی مجالس القدس وغیرہ کتابیں ان کی محنت جستجو اور سب سے بڑھ کر پاکیزگی ذوق اور نکہ شوق کی ترجمان ہیں، یہ ساری خوبیاں ایک طرف اور اخلاق حسنہ اور شمائل مسنونہ کی عملداری سب پر بھاری، کیا تبسم، کیا پیارا انداز گفتگو، معمولی سا شخص بھی ان کی مجلس میں خود کو خوش نصیب ترین سمجھنے لگتا، اب ایسی پیاری اور دلآویز شخصیتیں شاید خال خال ہی ہوں، ان کے انتقال کی خبر ملی تو واقعی یقین کے لیے دل و دماغ آمادہ نہیں ہوئے، لیکن حقیقت سے انکار بھی تو ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین

مولانا محمد امین عثمانی

۲ ستمبر کو اخباروں سے خبر ملی کہ مولانا امین عثمانی نے بھی اپنا رخت سفر باندھ لیا اور راہی عالم بقا ہوگئے، بظاہر شہرت کے بال و پر سے خالی تھے لیکن وہ ان لوگوں میں تھے جن کی بلند پروازی ان کو وقتی طور سے مستور اور نگاہوں سے دور بنادیتی ہے، مگر ان کی زندگی اور عمل پیہم کی صفت سے ان کو ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور بھی کردیتی ہے، قریب ستر سال کی عمر پائی، ندوہ سے فضیلت کی سند حاصل کی، دوران تعلیم ان کی وضع قطع اور طور طریق سب ان کے صوفی اور خانقاہی ہونے کا اشارہ دیتے تھے، بعد میں جب وہ جامعہ ملیہ پہنچے تو صوفی ہونے کے ساتھ ان کا وہ جوہر بھی سامنے آیا جس کی وجہ سے وہ قاضی مجاہد الاسلام کی نگہ انتخاب میں آئے، اسلامک فقہ اکیڈمی سے وابستہ ہوئے اور کسی قدیم وضع دار کی طرح آخر تک اس رشتہ کو برقرار و استوار رکھا، فقہ اکیڈمی نے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مسائل سے جوڑنے اور حل تلاش کرنے کے لیے جتنے اور جیسے مذاکرے منعقد کرائے اور پھر ان کی اشاعت کا سامان کیا، اس کی اپنی ایک الگ اور روشن تاریخ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اکیڈمی صرف ہندوستان ہی نہیں بین الاقوامی طور پر متعارف ہوئی، قاضی مجاہد الاسلام مرحوم کے بعد اس اکیڈمی کا کارواں جس طرح جاری رہا وہ دراصل

امین مرحوم کی اس محنت وتدبیر کا نتیجہ ہے جس کو مرحوم نے خود کو ہر حال میں مخفی رکھ کر کامیاب بنایا، ہر دلعزیز تو وہ ندوہ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی تھے، بعد میں یہی خوبی ان کی ہر جگہ نمایاں رہی، ان کے جانے کے بعد اب راز کھلا کہ وہ کتنے قیمتی تھے، فقہ اکیڈمی ہی نہیں جماعت اسلامی کے تحقیقی ادارہ، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ اور جماعت ہی کے ایک شعبہ شریعہ کونسل کے وہ تاسیسی اور اہم رکن بھی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو شرف قبولیت سے نوازے اور ان کے اداروں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

سید حافظ سراج الحسن مجددی بھوپالی

بھوپال کی مشہور خانقاہ مجددیہ کے زیب سجادہ، دارالعلوم تاج المساجد کے امیر اور مدھیہ پردیش کے خدا جانے کتنے دینی اداروں اور مدارس کے سرپرست جناب سید سراج الحسن کی وفات یقیناً حسرت آیات ہے، وہ شاہ محمد یعقوب مجددی کے بیٹے اور شاہ محمد سعید میاں مجددی کے بھائی ہی نہیں بھوپال کے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر سرمایہ وقار وسکینت تھے، ۲ ستمبر کو وہ رخصت ہوئے تو چند دن پہلے ان سے نیاز حاصل کرنے والوں کو یقین ہی نہیں آیا کہ ابھی جن کی محفل سے اٹھ کر آئے اب وہ محفل ہی نہ رہی، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نسل کا خاتمہ بھی سراج میاں کے ساتھ ہوگیا، وہ پیر صاحب تھے اور اس خانقاہ کی سجادگی پر فائز تھے جس کی شہرت زمان ومکان سے بھی پرے تھی، مگر انہوں نے اپنے کسی بھی عمل سے کسی بھی شخص پر پندار مسند کا شائبہ تک نہ آنے دیا، اخیارِ ملت کے تذکروں میں بعض بعض بزرگوں کی معصومیت، سادگی اور خاکساری کی باتیں، پرلطف ہونے کے ساتھ ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن بھوپال کی عام زبان میں سراج میاں کو جنہوں نے دیکھا اور جن کو ان کی مجلس میں حاضری کا موقع ملا ان کے لیے روایتیں حقیقت بن جاتی تھیں، دینی اداروں کے لیے موجودہ زمانہ میں شرور وفتن کی بڑی آزمائشیں ہیں، سراج میاں جیسی شخصیتیں ان کے لیے سپر بن جاتی ہیں، ایسے میں ان کا نہ ہونا بڑا نقصان اور ملت کا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے جانشینوں کو حوصلہ اور ہمت بخشے۔ آمین

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مرحوم

آہ، ستمبر کی ستم گری تھمی نہیں، ۱۵ر ستمبر کو یہ روح فرسا خبر برادرم پروفیسر جمشید احمد ندوی سے فون پر ملی کہ ان کے استاد اور ایک دنیا کے ممدوح پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے علی گڑھ میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی، ایک عالم، معلم، مربی، محقق، مصنف، مورخ، ادیب، خطیب، علم کا ایک سیارہ جو کوکب دری کی طرح فلک علوم پر روشن تھا اور جس کی روشنی سے ایک عالم منور تھا، ٹوٹا اور پھر آسمان علم کی بے کرانی میں کہیں گم ہوگیا، ان کی بیماری کا علم بہت دیر سے ہوا لیکن ان کی وفات کی خبر اتنی جلد آ گئی، یہ بھی شاید ان کی

ایسی اداتھی جو ان کی دوسری اداؤں کی طرح ان کو سب سے جدا اور سب سے الگ بناتی تھی۔

لکھیم پور کھیری کا ایک قصبہ گولا گوکرن ناتھ ان کا مولد تھا، پیدائش کی تاریخ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء کی ہے، والد صاحب کا نام انعام علی تھا، یٰسین صاحب اصل معلم و مربی کی حیثیت سے ہمیشہ ان کا نام لیتے رہے، وہ اپنے والد کے نام کی طرح صحیح معنوں میں اپنے خاندان کے لیے ایک انعام تھے، مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ میں جب وہ سید سعید احمد خیرآبادی کے سامنے ابتدائی تعلیم کے لیے پیش ہوئے تو کیا خبر تھی کہ یہ بچہ ایک دن دارالعلوم ندوۃ العلماء کا فاضل اور لکھنؤ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں تک حصول تعلیم کے لیے پہنچے گا اور پھر ان کی سرخروئی کا سبب بھی ہوگا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید محمد رابع ندوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والا، ڈاکٹر نورالحسن، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے افاضل کی مجلس درس میں بھی نظر آئے گا اور علوم کی جامعیت کی گویا مثال بن کر خدا جانے کتنوں کے لیے قابل رشک ہوگا اور لائق تقلید بھی۔

وہ جامعہ ملیہ کے طالب علم تھے کہ ان کے بعض اساتذہ نے ان کو تاریخ کے مطالعہ و تحقیق کے لیے علی گڑھ کے شعبہ تاریخ کی سیر کا مشورہ دیا، اس طرح وہ علی گڑھ آئے اور پھر پلٹ کر نہ دیکھا، ایم اے کے مقالہ کے لیے کتاب ظفر الوالہ کے دو حصوں کا ترجمہ اور تعلیقات کا کام دیا گیا اور ان ہی کے الفاظ میں ریسرچ اور تحقیق کی لت اسی سے لگی، انھوں نے پروفیسر نورالحسن کے لیکچروں کے بارے میں لکھا کہ وہ بہت خوبصورت، جاندار، عالمانہ، ناقدانہ اور محبوبانہ ہوتے تھے، یہی خوبی بعد میں ان کے چاہنے والوں کی زبان پر ان کے لیے آگئی، تحقیق کا عمل جیسے ان کے خمیر میں شامل ہوگیا اور اس کا سب سے بہترین اظہار سیرت نبویؐ کے مطالعہ اور نتائج مطالعہ کی شکل میں آیا، وہ سیرت نگار نہیں تھے لیکن سیرت نگاری پر ان کی سی نظر دور دور تک کہیں اور نظر نہیں آتی، سیرت کے تمام مصادر کا ہر مضمون گویا ان کے سامنے تھا، مصادر ہی نہیں کتب سیرت خواہ قدیم ہوں یا جدید، سب ان کے لیے مستحضر، ایک کمال یہ بھی تھا کہ قدیم مصادر سیرت کے بین السطور سے وہ ایسی معلومات اخذ کر لیتے جو عام بلکہ خاص سیرت نگاروں سے بھی رہ جاتیں، ان کے مقالات، خصوصاً معارف میں، ہمارے اس خیال کے قطعی مؤید ہیں، ہم کو حیرانی بھی ہوتی کہ ان کے مطالعہ اور استخراج نتائج کی تکنیک آخر کیا ہے؟ وجہ ظاہر ہے ان کی غیر معمولی محنت، جستجو اور ژرف نگاہی ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کو قبولیت بخشی، برصغیر ہندو پاک میں ان کی خدمات کا اعلیٰ و ارفع شکل میں اعتراف کیا گیا، کئی بڑے اعزازوں سے وہ نوازے گئے، ان کی کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ہر کتاب اپنے صفحات میں کچھ نہ کچھ نیا پن پیش کرتی رہی، شعبۂ

تاریخ سے وہ شعبہ علوم اسلامیہ میں منتقل ہوئے، موضوع بظاہر بدل گئے لیکن ان کی محنت اور ان کے مطالعہ و تحقیق کا رنگ نہیں بدلا، شعبہ علوم اسلامیہ میں ان کو ایک ذیلی لیکن بڑی ذمہ داری ملی، یہ شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل کے تحت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم کی اشاعت کا معاملہ تھا، اس کے تحت برسوں انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک سیمینار کرائے، اہل علم و تحقیق کے ذریعہ انہوں نے جس طرح شاہ دہلوی کے علوم سے روشناس کیا وہ بھی کمال کی بات ہے، شاید ہی اس سے پہلے شاہ صاحب کی کتابوں، ان کے اصول و نظریات اور ان کی اہمیت و افادیت پر اتنا پڑھا اور لکھا گیا ہو، ان سیمیناروں میں بڑے تو ہوتے ہی تھے کبھی کبھی از راہ محبت و عنایت ان سے ایسی چوک بھی ہو جاتی کہ بعض نا اہل کلیدی خطبہ تک کے لیے پکارے گئے، سیمیناروں کا انعقاد اور ان میں شرکت ان کی علمی زندگی کا نمایاں عنوان ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ چسکا بھی ان کے اساتذہ خصوصاً پروفیسر خلیق احمد نظامی کا لگایا ہوا تھا، ان کی مقالہ نگاری کی مشق، ہسٹری کانگریس کے جلسوں میں شرکت سے ہی ہوئی اور بعد میں تو کسی علمی سیمینار کا تصور بھی ان کے بغیر مشکل تھا، دارالمصنّفین کے قریب تمام سیمیناروں میں وہ شریک ہوئے، شریک کیا وہ جانِ محفل بنتے رہے، کلیدی خطبہ ہو، تاثرات کا بیان ہو، الوداعی تقریر ہو، ہر موقع پر ان کی گفتگو، ان کو سب کی نگاہوں کا مرکز بنا دیتی، ان کی اس مقبولیت میں یقیناً تاثیر ان کی اس خدمت کی ہے جو انہوں نے سیرت نگاری کے ذریعہ کی، ورنہ لکھا تو انہوں نے اور بھی بہت کچھ، معارف میں ان کی آخری تحریر ''خطوط ماجدی'' کے عنوان سے تھی، وہ انشائے ماجد ہی نہیں، ادب و انشا کے اعلیٰ ذوق کے حامل تھے، مشتاق احمد یوسفی سے ان کی محبت اور ان کے جملوں کے حفظ اور پھر باتوں باتوں میں ان کا استعمال دراصل ان کے ذوق کی جامعیت کی علامت ہے، برجستگی، لطیف طنزیہ جملے اور خوش بیانی ان کی شخصیت میں کچھ اس طرح رل مل گئے تھے کہ سننے والے یہی کہتے کہ ع: جی بہت لگتا ہے صحبت میں ان کی، ان کی کتابوں اور مقالات و مضامین کے بیان کے لیے یہاں گنجائش نہیں، لکھنے والے لکھتے رہیں گے، ہاں دارالمصنّفین سے ان کی محبت کی باتیں بھی بھلا دینے والی نہیں، ناظم دارالمصنّفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی ان کی رفاقت قریب ۳۵۔۴۰ سال کی ہے، علی گڑھ میں طالب علمی کی زندگی سے اب تک یہ ساتھ رہا، ان کے اکثر مضامین میں ظلی صاحب کا ذکر ضرور آتا ہے، ان کے اس طرح رخصت ہونے کے درد میں دارالمصنّفین اپنے ناظم کے ساتھ برابر کا شریک ہے، ستمبر کے ان تمام مرحومین کے لیے زبان پر بس مغفرت کی دعا ہے اور ساتھ ہی دل سے اٹھنے والا یہ یقین بھی کہ ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم سب اسی کی جانب لوٹنے والے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!!　　　(ع۔ص)

ادبیات

غزلیہ حمد

☆جناب زاہد جعفری

وہ! فکر و خواب، یقینِ خیال دیتا ہے ہراس ہجر نوید وصال دیتا ہے
وہ! بیکرانی ادوار ہے مگر ہم کو حصار روز و شب و ماہ و سال دیتا ہے
وہ! رکھ کے روٹی کے ٹکڑوں میں نعمت کونین ہم اہل غم کو دوائے ملال دیتا ہے
وہ! چہرہ آتا ہے آنکھوں میں اور نہ ذہنوں میں وہ آئینوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے
وہ! چاہتا ہے مجھے کائنات پہچانے وہ لاکھوں آنکھوں کو نور کمال دیتا ہے
وہ! لفظ لفظ کا خالق، وہ حرف حرف کا رب قلم قلم کو عجب خط و خال دیتا ہے
وہ! نطق دیتا ہے پتھر کو بھی مگر زاہدؔ بشر کو تاب سخن خال خال دیتا ہے

تاریخ درگذشت

پروفسور یاسین مظہر صدیقی ندوی

☆☆ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

فخر عالم بہ من گفت دیروز تلفنی، این حدیث غم آور
یعنی یاسینِ مظہر کہ بودہ یک نویسندۂ خوب و اشہر
رفت بربست زین بزم عالم شد رواں سوی دنیای آخَر
یاسر کلکِ سالش نوشتم ”فوت گردید یاسینِ مظہر“

۲۰۲۰ء = ۲۰ × ۲۰۰۰

(۱۴۴۲ھ)

☆جعفری باغ، جلال پور، فیض آباد موبائل: ۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸۔

☆☆نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر۔بی، (جمال پور) علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

تذکرہ علمائے ہندوستان از مولانا محمد سید حسین بدایونی، تحقیق، تدوین، تحشیہ: ڈاکٹر خوشتر نورانی، قدرے بڑی تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۹۴۴، قیمت ۱۱۰۰/روپے، پتہ: مکتبہ جام نور ۴۲۲، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔

مسلمانوں کے علمی خزانوں میں تذکرہ نگاری کو جس طرح سرمایہ ناز و فخر کی حیثیت حاصل ہوئی، وہ اب محتاج بیان نہیں، شخص اور اجتماعی دونوں قسم کے تذکروں سے اردو زبان کی ثروت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، زیر نظر ضخیم کتاب بھی قریباً سوا سو سال پہلے ایک صاحب ذوق کی محنت کا نتیجہ ہے جس میں سیکڑوں ہندوستانی علما کا کہیں مفصل، کہیں مختصر ذکر آ گیا ہے۔

سوا سو سال پہلے فرد فرید کی اس کاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں، لیکن شاید وہ زمانہ اسی قسم کی کرامات کا دور تھا، مولانا سید محمد حسین اس کتاب کے مولف، بدایوں کی علمی روایتوں کے امین اس طرح ہوئے کہ علم دین کے ساتھ علم نجوم و فلکیات کے بھی ماہر تھے، شعر گوئی تو گویا بدایوں کی فضاؤں میں رچی بسی تھی، خاندان بھی اہل علم و فن کا تھا، ایسے میں مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء کا ظہور، امکانات سے بعید بھی نہ تھا، وہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور 1918ء میں وفات پائی، یہ وہی زمانہ ہے جب ہندوستان کے آسمان سے یاقوت و جواہر کی بے نظیر بارش ہوئی اور اردو زبان کو ثروت و سطوت و حشمت سب عطا کر گئی، اس دور میں اور بھی تذکرے لکھے گئے، چھپے بھی، مگر یہ تذکرہ خدا جانے کیوں مطابع کی راہ نہ پاسکا، فاضل مرتب کا یہ احساس بجا ہے کہ عمومیت اور کیفیت و کمیت کے اعتبار سے یہ جامعیت کا حامل تذکرہ تھا، مولانا محمد ادریس نگرامی کا تذکرہ تطییب الاخوان بذکر علماء الزمان معروف بہ تذکرہ علمائے حال اسی دور میں طبع ہوا، وہ ضخامت میں زیر نظر تذکرہ سے کہیں کم لیکن اختصار کے باوجود جامعیت کا حامل ہے، فاضل مترجم نے اسے ایک المیہ سے تعبیر کیا کہ مظہر العلما اب تک شائع نہ ہوسکا لیکن یہ شکر کی بات ہے کہ وہ بدایوں کی خانقاہ عالیہ قادریہ میں محفوظ رہا اور کسی صاحب نظر قدرداں کا منتظر بھی رہا، اب یہ جس سلیقہ اور شان سے طبع ہوا، اس سے قسمت اور نصیبہ جیسے الفاظ پر یقین اور بڑھ گیا، مخطوطہ کو جن سخت مراحل سے گزر کر مطبوعہ بنایا گیا اس کی داد معارف کے ایک شمارہ میں جناب عارف نوشاہی دے چکے ہیں، یہاں صرف ایک تعارف کے طور پر اس اہم اور قیمتی کتاب کا ذکر مقصود ہے جو آج کے قاری کی سہولت کے لیے تذکرہ علمائے ہندوستان

کے نام سے پیش کی گئی ہے، مصنف کا مفصل تعارف پھر مخطوطہ کی خصوصیات یعنی اس کے پس منظر کے ساتھ اس کی ترتیب، مشمولات، دیگر نسخوں سے مقارنہ اور پھر اس کی استنادی حیثیت پر نہایت دیدہ ریزی سے بحث کی گئی، تیسرا باب یہ اصل کتاب ہے، الفبائی نہج پر تراجم ہیں، چوتھے باب کو تکملہ سے تعبیر کیا گیا، مرتب کے مطابق اس میں مصنف علام نے ان علماوادبا کی فہرست دی ہے جن کے احوال دستیاب نہیں تھے، مرتب نے بعض مقامات پر اجمالی احوال دیے ہیں لیکن فرق وامتیاز کے لیے وہاں بریکٹ کی علامت دے دی گئی ہے، فاضل مرتب کا یہ عمل بھی بڑا اہم ہے کہ انہوں نے حواشی و تعلیقات کے لیے جن کتابوں سے استفادہ کیا اور یہ قریب تین سو کی تعداد میں ہیں، ان کی بھی ایک جدا کتابیات دے دی ہے، پیش لفظ میں بھی متنی تنقید اور تذکروں کے موازنہ کے تعلق سے کار آمد گفتگو کی گئی ہے، سینکڑوں تراجم میں یہاں کوئی ایک نمونہ پیش کرنے سے صحیح رائے قائم نہیں ہوسکتی، قدرتاً ہم نے علامہ شبلی کا ترجمہ دیکھا، تعجب ہوا کہ ندوۃ العلماء کے حوالہ سے کوئی اشارہ بھی نہیں، ہاں یہ جملہ ضرور ہے کہ ''غیر مقلدین کی تردید وتعذیب تاحیات مدنظر رہی، فرماتے کہ انسان عیسائی ہوسکتا ہے مگر غیر مقلد کسی طرح نہیں ہوسکتا''، یہ بھی لکھا گیا کہ علی گڑھ سے مستعفی ہو کے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا، بہ نسبت شبلی مولانا حالی کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے۔

دانش سہیل، مرتب ڈاکٹر شباب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۵۲، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: ضیاء الدین خاں میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، بڈھریا، اعظم گڑھ اور علی گڑھ، مئو کے مشہور مکتبے۔

اسیر، دیوار زنداں، ذوق مرگ، عزم سفر اور آشفتہ سر جیسے الفاظ اگر پیمانے ہیں تو ان سے کسی بھی شاعر کے کلام کے درجہ حرارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، علامہ اقبال سہیل بھی اسی زمانہ کے ہیں جب لگتا ہے ہندوستان کی سرزمین نے اپنے سارے ہیرے موتی ملک کی جھولی میں ڈال دیے تھے، وطن اعظم گڑھ تھا جہاں کی مملکت علم پر حکمرانی شبلی وفراہی کی تھی، اقبال سہیل کو تو نورتنوں میں ہونا ہی تھا، علی گڑھ بھی کیا علی گڑھ تھا جہاں رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے طلبہ تھے، اقبال سہیل کے بال و پر بھی وہیں پیدا ہوئے اور آشفتہ سری نے بھی سر وہیں اٹھایا، کیا اٹھان تھی کہ شبلی جو بقول شخصے سعدی وحافظ کے ہم پلہ اپنا فارسی کلام سمجھتے تھے، ان کو نوعمر اقبال سہیل کی شاعری پر اپنے کلام کا دھوکہ ہوجاتا، وہ اصلاح کیا کرتے بس یہی نصیحت کافی سمجھی کہ خود ہی اپنے کلام کی معاندانہ تنقید کرو، تو مشق و

ممارست سے چند ہی دنوں میں بازوئے فکر توانا ہوجائیں گے، ایسا استاد ہو تو شاگرد کو ایک دن نابغہ ہونا ہی ہوتا ہے، اس کتاب میں بس اسی اجمال کی تفصیل ہے، کتاب ان مقالات اور مضامین کا دلکش مجموعہ ہے جو علامہ اقبال سہیل کی یاد میں ایک اعلیٰ درجہ کے سیمینار میں پیش کیے گئے، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر مولا بخش جیسے پروفیسروں کی بڑی تعداد کے ساتھ علما اور دانشوروں کے مقالات نے اقبال سہیل کی زندگی کے ہر گوشہ کو روشن کر کے ایک عالم کو حیرت کی نعمت عطا کر دی، ایسے جملے اور کہاں سننے میں آتے ہیں کہ اقبال نے مقام شبیری کو بھی حقیقت ابدی ہی قرار دیا ہے، یہی جہاں بانی اور نگہبانی کا سرّ نہاں ہے جسے اقبال سہیل نے اشاراتی اسلوب میں کائنات کا تکوینی نظام تسلیم کیا ہے، علامہ شبلی کی زود حسی بہت مشہور ہے، اقبال سہیل کیسے اس روایت سے بے نیاز رہ سکتے تھے، شعر کے نزول کے لیے بے پناہ شدت کا احساس ملزوم ہے، ایسے کلمات حق یا عبدالحق کا نزول بھی شدت احساس کے لیے لازم ہے جو یہ دیکھ سکے کہ غم ملت کا درد کس کو تھا اور کیوں؟ کتاب میں ایک مضمون حیرت کی فراوانی کے عنوان سے ہے۔ اقبال سہیل کی پوری زندگی آئینہ حیرت معلوم ہو تو نظارہ بین کی کیا غلطی؟ جو کلام، کمال تک پہنچنے سے پہلے ہی دعویٰ کر دے کہ ع: خود طبع سخن سنج ہے استاد ہماری، وہاں بجز حیرت کے اور کیا رہ جاتا ہے، وہ شاعر ہی کیا جس کو خود پر اعتماد ہی نہیں ناز بھی ہو کہ ؎

ہر ایک ساز سے سنتا ہوں اپنی ہی آواز فضا میں گونج رہی ہے فقط صدا میری

وارفتگان شوق تو بہت ہوئے لیکن یہ بانکپن کم ہی کو نصیب ہوا کہ

ع: جس در پہ دی صدا، درِ جاناں بنادیا

اردو اور فارسی دونوں زبانیں جیسے خانقاہ سہیل کی محرابوں میں ہمیشہ سربسجود رہتیں، فارسی قصائد ان نغموں کی طرح ہیں جو گو سمجھ میں نہ آئیں لیکن ان کی موسیقیت اور ترنم خیزی عالم کیف میں پہنچا کر رہتی ہے اور جب یہ نعت نبویؐ کے قالب میں ڈھلتی ہے تو صحیح کہا گیا کہ قافیہ در قافیہ صوتی جھنکار میں موجود معنوی آہنگ و ترنگ سامع کو کسی اور ہی عالم سے آشنا کرتی جاتی ہے، بات مقالات و مضامین کی ہو رہی تھی لیکن اقبال سہیل کا قاری سحر زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، شاعری، نثر نگاری، وکالت، سیاست، ملی غیرت، قومی حمیت سب اسی شعور سے سرشار کہ ؎

اف کیا مزہ ملا ستم روزگار میں کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں

ایک کتاب سے اور کیا چاہیے؟ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

اے نور نظر: شیخ محمد خیر یوسف، مترجم محمد اجمل قاسمی، ریان بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور۔ قیمت درج نہیں۔

ٹمل ناڈو کا مفکر شاعر دانش فرازی: جناب علیم صبا نویدی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید حبیب، ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چینائی۔ قیمت ۳۰۰ روپے

حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلالی عثمانی: زندگی کے تابندہ نقوش، جناب طارق عمیر عثمانی، دارالسلام اسلامی مرکز، مالیر کوٹلہ، پنجاب۔ قیمت ۲۰۰ روپے

خواتین ٹمل ناڈو کی روشن تحریریں: جناب علیم صبا نویدی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید حبیب، سہ ماہی نور جنوب، چینائی۔ قیمت ۳۰۰ روپے

سفر کی خوشبو (سفر نامہ) ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈومن پورہ چنگی، مئو۔ قیمت ۱۸۰ روپے

علمائے فرنگی محل: مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی، مترجم ڈاکٹر خوشتر نورانی، مکتبہ جام نور، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت ۴۰۰ روپے

علیم صبا نویدی کے خطوط مدیران رسائل کے نام: جناب علیم صبا نویدی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید حبیب، سہ ماہی نور جنوب، چینائی۔ قیمت ۵۰۰ روپے

کہکشانِ جامعہ: مولانا محمد ثناء اللہ عمری، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام عمرآباد۔ قیمت ۱۲۰ روپے

مراثی وفات غالب: مرتب جناب آصف ظفر، نعیمیہ بک ڈپو، صدر چوک، مئو۔ قیمت ۳۰۰ روپے

نقوش شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ قیمت ۴۰۰ روپے

ہندو پاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات: جناب ضیاء الدین فلاحی، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ قیمت ۵۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

- سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) 2000/-
- سیرۃ النبیؐ
- (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) 2200/-
- علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی
- مقدمہ سیرۃ النبیؐ 30/-
- الفاروق 300/-
- الغزالی 200/-
- المامون 175/-
- سیرۃ النعمان 300/-
- سوانح مولانا روم 220/-
- شعر العجم اول 300/-
- شعر العجم دوم 150/-
- شعر العجم سوم 125/-
- شعر العجم چہارم 200/-
- شعر العجم پنجم 150/-
- الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی 350/-
- (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی
- الکلام 250/-
- علم الکلام 200/-

- موازنہ انیس و دبیر 250/-
- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر 100/-
- سفرنامہ روم و مصر و شام 200/-
- کلیات شبلی (اردو) 220/-
- کلیات شبلی (فارسی) 45/-
- مقالات شبلی اول (مذہبی) 170/-
- مرتبہ: سید سلیمان ندوی
- مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃 70/-
- مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃 80/-
- مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃 200/-
- مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃 150/-
- مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃 90/-
- مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃 100/-
- مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃 110/-
- خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی 80/-
- انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی 45/-
- مکاتیب شبلی اول 〃 150/-
- مکاتیب شبلی دوم 〃 190/-
- اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات) 250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print

OCTOBER 2020 Vol - 206 (4)

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

Darul Musannefin Shibli Academy

P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفرالاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-